اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ

"سالنامہ اللطیف باغِ کلام"

۴۱ ــــــــ ھ ــــــــ ۱۴

علمی دینی اصلاحی اور معلوماتی

# سالنامہ

# اللطیف

## ویلور

دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

| سالنامہ ۱۴۴۱ھ | 2020ء | شمارہ نمبر ۵۹ |
|---|---|---|

''سالنامہ اللطیف باغِ کلام''

۱۴ــــــھــــــ۴۱

# اللطیف ویلور

بیادگار

شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی

ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری رحمۃ اللہ علیہ

سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور۔

مولانا مولوی

ابوصالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری رحمۃ اللہ علیہ

المعروف بہ میراں پاشاہ

مدیر موسس

حضرت اقدس مولانا مولوی

ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اجراء :۸رشعبان المعظم ۱۴۴۱ھ م 02/اپریل 2020ء بروز جمعرات

## سرپرست

## سیدشاہ محمد طاہر قادری

سجادہ نشین خانقاہِ حضرت قطبِ ویلور

### مدیرانِ مسئول

مولانا مولوی حافظ ڈاکٹر **ابوالنعمان بشیر الحق قریشی لطیفی**

یم،اے،پی،ہچ،ڈی۔

مدرس دارالعلوم لطیفیہ ویلور۔

مولانا مولوی قاری **یم بی شیخ فضل اللہ** لطیفی

یم،اے،یم فل

مدرس دارالعلوم لطیفیہ ویلور۔

### نمائندگان طلباء

| | | |
|---|---|---|
| ۱ | کے۔کے۔انور | کیرلہ |
| ۲ | اے۔کے۔عمر فاروق | کیرلہ |
| ۳ | کے۔ٹی۔جعفر | کیرلہ |
| ۴ | پی۔کے۔محمد اعجاز | کیرلہ |
| ۵ | پی۔اے۔احمد شفیق | کیرلہ |

## بسم اللہ الرحمن الرحیم

## فہرست مضامین سالنامۂ اللطیف ویلور ١٤٤١ھ مطابق 2020ء



| شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| ١ | مناجاتِ قربیؔ | حضرت قربیؔ ویلوری | 4 |
| ٢ | رباعیات امجدؔ | حضرت امجد حیدر آبادی | 5 |
| ٣ | روئداد دار العلوم لطیفیہ | ادارہ | 6 |
| ٤ | افتتاحیہ | ادارہ | 8 |
| ٥ | جواہر القرآن | مولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی | 12 |
| ٦ | جواہر الحدیث | مولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی | 16 |
| ٧ | نقوشِ طاہر | ادارہ | 25 |
| ٨ | مولانا سید شاہ عثمان قادری جوار رحمت میں | مولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی | 29 |
| ٩ | مولانا محمد سالم قاسمی - حیات وخدمات | ڈاکٹر سید سجاد حسین | 32 |
| ١٠ | اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار | ڈاکٹر قاضی حبیب احمد | 36 |
| ١١ | اردو نظموں میں قومی یکجہتی کا پیغام | ڈاکٹر امان اللہ ایم بی | 43 |
| ١٢ | مصباح الحیات | الحاج منصور علی خان قادری | 49 |
| ١٣ | مختصر داستانِ حضرت صابر پیا کلیریؒ | صوفی کے سید احمد ابو العلائی | 51 |
| ١٤ | پھل اور سبزیاں غذا بھی دوا بھی | ڈاکٹر نعمان باشاہ قریشی | 54 |
| ١٥ | حضرت حکیم ابن حزامؓ کی شخصیت | مولانا امتیاز احمد رشادی | 56 |



## منظومات



| | | | |
|---|---|---|---|
| ١٦ | جذب وسلوک | علامہ سید آمر کلیمی شاہ نوریؒ | 62 |
| ١٧ | چشمِ الطاف | جعفر شریف المتخلص ظفر و عادل | 63 |
| ١٨ | نعتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم | مولانا ڈاکٹر سید نیاز احمد جمالی | 64 |

پیش کش:

# مناجات قربیؒ

سید شاہ محمد طاہر قادری
سجادہ نشین خانقاہِ حضرت قطبِ ویلور

قدوۃ السالکین حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی علیہ الرحمہ (۱۱۱۸ھ ۱۱۸۲ھ) نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں مرتب کیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف ۳۴ سال تھی۔

آپ کے دیوان میں پہلے حمد ہے پھر نعت ہے۔ اسکے بعد ۸۸ غزلیات ہیں، ابیات تقریباً ۱۹۷۶ ہیں۔ دیوان مناجات اور دعا پر اختتام پذیر ہے۔ حضرت قربیؒ کا کلام آپ کے دیوان سے ترتیب وار ناظرین اللطیف کی خدمت میں پیش ہے۔

محبوب کے اوپر سوں جیوں کو نثار کرنا — یک جیوں کیا اچھیگا بل صد جیوں کرنا
اس زلف مشک سا کا ہر تار مار دستا — دل باندھنے کو اس میں نا تار مار کرنا
دے اختیار میں اس سب اختیار اس کا — اس کی رضا میں چلنا نِت اختیار کرنا
نفسانیت کا دریا دریای بیکراں ہے — اللہ کی مدد سوں کشتی کوں پار کرنا
ہر چیز دو جہاں میں بیگانہ حق سوں نیں ہے — یوں نکتہ ہو یگانہ توں اعتبار کرنا
یک کو ہزا کرنا کرنا ہزار کو یک — مذہب میں عاشقاں کے ہے یوں شمار کرنا
گر کارِ عشق کرنا اپنے پو بار عرفاں — صحبت میں عاشقاں کی یوں کاروبار کرنا

دل کی زمیں برہ سوں کر داغ داغ قربیؔ
عشاق کے چمن میں یوں لالہ زار کرنا

# رباعیات امجدؒ

حضرت امجدؔ حیدرآبادی

حضرت امجدؔ حیدرآبادی علیہ الرحمہ رباعیات کی دنیا میں اپنی ایک مستقل اور جداگانہ شناخت رکھتے ہیں ان کی رباعیات میں تصوف کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ حضرت صوفی منش امجد کے کلام کو حرزِ جان سمجھتے ہیں۔ اہل دل حضرات کی خدمت میں رباعیات امجد حصہ اول مطبوعہ ۱۳۸۸ھ کے نسخہ سے چار رباعیات پیش ہیں۔

تنزل الملئکۃ والروح　　　شب قدر میں روح اور ملائکہ نازل ہوتے ہیں

تن کی کشتی میں نوح بن کر آیا
ساغر میں مرے صبوح بن کر آیا
خیرٌ من الفِ شہر ہے آج کی رات
وہ پیکرِ جاں میں روح بن کر آیا

کم ظرفی

کم ظرف اگر دولت و زر پایا ہے
مانند حباب اُبھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیں
تنکا تھوڑی ہوا ہے اُڑ جاتا ہے

وجود حِسی

آغشتہ بہ خوں پیالہ لالہ ہے
ہر گوہر آبدار تبخالہ ہے
ادنیا کا وجود ہے وجودِ حِسی
یہ دائرہ شعلۂ جوالہ ہے

آغوش محبت

دو دل اک ہوں تو نخل جاں پھلتا ہے
دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
سچ یہ ہے کہ برقی روشنی کے مانند
دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

# روئداد دارالعلوم لطیفیہ

الشریعة اقوالی و الطریقة افعالی و الحقیقة احوالی و المعرفة اسراری ۔فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ شریعت میرے اقوال ہیں طریقت میرے افعال ہیں اور حقیقت میرے احوال ہیں اور معرفت میرے اسرار ہیں۔

حدیث مذکورہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شریعت وطریقت حقیقت ومعرفت سب ایک حقیقت کے مختلف رخ ہیں جوسب کے سب اصول شریعت ہی کا نام ہے۔حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ''بنائے طریقت بر کتاب و سنت است و ہر چہ مخالف کتاب وسنت مردود و باطل است''یعنی ہمارے طریقت کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول صلعم پر ہے جو بھی اس کے مخالف ہے وہ مردود و باطل ہے۔

ایک صوفی جو خدا تک پہنچنا چاہتا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ شریعت مطہرہ کا دامن چھوڑ دے اور خدا تک پہنچ جائے غور فرمایئے؟ کہ انسان کی فضیلت حیوانات پر اسلئے ہے کہ وہ عقل مرشد وفکر ہادی سے نوازا گیا ہے۔اگر اس کے باوجود وہ آداب واحکام الٰہی سے غافل ہوجائے تو وہ زمرہ انسانیت سے خارج کردینے کا مستحق ہے۔

ہمیشہ سے دارالعلوم علم شریعت کے ساتھ حقیقت ومعرفت کے علم سے طلباء کو مزین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

**آغازِ سال:** ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے طلبۃ العلوم کا داخلہ ۱۵/ماہ جون ۲۰۱۹ء سے شروع ہوا۔

**دورۂ حدیث:** بخاری شریف ومسلم شریف کے دورۂ حدیث کا آغاز بدست عالیجناب ڈاکٹر مولانا سید شاہ عثمان شاہ قادری صاحب ناظم دارالعلوم کی دعاؤں سے مورخہ ۱۸ جون سے شروع ہوا اور بحمد اللہ ۱۹/مارچ ۲۰۲۰ء بروز جمعرات سید شاہ محمد طاہر قادری سجادہ نشین کی دعاؤں سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔

**افتتاحی اجلاس:** انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی جلسہ مورخہ ۲۶/ماہ جون ۲۰۱۹ء بعد نماز ظہر دارالعلوم لطیفیہ کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔جس کی صدارت عالیجناب ڈاکٹر سید شاہ عثمان شاہ قادری، ناظم دارالعلوم نے کی۔جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن شریف ونعت شریف کے ساتھ ہوا۔اس کے بعد مہمان خصوصی کی حیثیت سے عالی جناب مولانا مولوی سید نیاز احمد جمالی، ناظم جمالیہ عربک کالج مدراس نے طلباء سے خطاب فرمایا جسمیں موصوف نے علم کی اہمیت

اور استادوں کے آداب کے بارے میں سیر حاصل بحث فرمایا۔ نیز ایک اور مہمانِ خصوصی مدراس یونیورسٹی کے پروفیسر عالیجناب قاضی حبیب اللہ صاحب نے طلباء سے بصیرت افروز خطاب فرمایا۔

**نویدِ مسرت:** امسال بحمد اللہ تروویلور یونیورسٹی کے امتحانات افضل العلماء ادیب فاضل میں طلباء شریک رہے اور کامیابی حاصل کی۔

**امتحانات:** مورخہ ۱۸/نومبر 2019ء ششماہی امتحانات اساتذہ کرام کی نگرانی میں چلے مسلسل ۶/دنوں تک یہ امتحانات جاری رہے۔ نیز ۲۳/مارچ ۲۰۲۰ء سے سالانہ امتحانات شروع ہوئے اور مسلسل ایک ہفتہ تک جاری رہے۔

**عباپوشی وعطائے اسناد:** سید شاہ محمد طاہر قادری سجادہ نشین خانقاہِ حضرت قطب ویلور کی زیر صدارت مورخہ ۸/شعبان المعظم روز پنجشنبہ دارالعلوم کا سالانہ اجلاس بڑے پیمانے پر منعقد ہوا۔ جسمیں مقامی و بیرونی علمائے کرام علم دوست حضرات کثیر تعداد میں مدعو تھے اور سجادہ موصوف نے اپنے دست فیض اقدس سے طلباء میں عبا و اسناد عطا فرمایا۔

**ہدیہ تشکر:** ادارہ ان تمام مخلصین دارالعلوم کا مشکور ہے خصوصیت کے ساتھ مدیران اخبارات کا جنہوں نے اپنے موخر جریدوں میں اولین وقت میں دارالعلوم کی تمام کاروائیوں کو شائع فرمایا۔ اللہ رب العزت سے دست بادعا ہیں کہ تمام علم دوست حضرات اور دارالعلوم سے عقیدت رکھنے والوں کو دنیا و آخرت میں سرخروئی عطا فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وصحابہ اجمعین۔

☆☆☆☆☆

# افتتاحیہ

## ادارہ

انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی اور مغلیہ سلطنت جس کی عمر آٹھ سو سال رہی اس کے سقوط کے بعد فارسی کی جگہ انگریزی ملک کی سرکاری زبان بن گئی۔ مسلمانوں کی اکثریت اس زبان اور اس زبان میں موجود علوم وفنون سے ناآشنا تھی کیونکہ ان کا تعلق اب تک زیادہ تر فارسی زبان سے تھا جو مغل حکومت کی سرکاری زبان تھی، اس زبان سے نہ صرف خواص بلکہ عوام کی بڑی تعداد مربوط اور منسلک تھی اور وہ اپنی سرکاری دفتری اور معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی تکمیل فارسی کے ذریعہ کر رہے تھے۔ علماء وفضلاء اپنی تدریسی تعلیمی اور تحریری سرگرمیوں کو فارسی میں ہی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اردو زبان بول چال کی حد تک تھی۔ سب سے پہلے صوفیائے کرام نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہی زبان استعمال کی تاکہ عوام ان کی تعلیمات اخذ کرسکیں۔ ملک کے باشندے مسلمان اور ہندو دونوں برسر اقتدار انگریز حکومت کو صاحب سمجھ رہے تھے جس کی وجہ سے اس حکومت کے خاتمہ کے لئے حرب وضرب کا سلسلہ شروع کیا۔ اور مسلمان وقت کی حکومت سے نفرت وعداوت میں آگے آگے رہے اور انگریزوں کی دشمنی میں ان کی زبان انگریزی کے بھی دشمن ہوگئے اور یہ عداوت یہاں تک پہنچ گئی کہ انگریزوں کی مصنوعات بھی ترک کردی جسے ترک موالات کا نام دیا گیا۔

انگریزوں کی ذات اور ان کی زبان میں نفرت اور ان کے علوم وفنون کے ساتھ دوری اور مہجورہ کے مسئلہ میں مسلمانان شمال اور جنوب کے درمیان نمایاں فرق دیکھنے میں آیا۔ شمال میں حضراتِ علماء کی اکثریت انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا، جنوب میں علمائے کرام انگریز حکومت سے مخالفت کی لیکن انگریزی تعلیم کی مخالفت نہیں کی۔ حضرت قطب ویلور اور ان سے وابستہ علماء اور فضلاء نے انگریزی زبان سیکھی۔ حضرت قطب ویلور نے اسی زبان میں کوئن وکٹوریہ کو دعوت اسلام دی، ملکۂ برطانیہ نے آپ کے دعوت اسلام کے مکتوب کا جواب دیا، اور یہ اعتراف کیا کہ اسلام دین برحق ہے لیکن وہ چند وجوہ کے باعث اسلام قبول کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت قطب ویلور کا انگریزی زبان میں تحریر کردہ دعوت اسلام کا مکتوب جو ملکۂ برطانیہ کی خدمت میں پیش ہوا تھا تلاش بسیار کے باوجود راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوسکا۔ مولانا سید شاہ عبدالحی حسینی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے اپنی عربی تصنیف برھۃ الخواطر میں اس انگریزی خط کا ذکر کیا ہے۔

حضرت قطب ویلور کے عہد میں انگریز حکومت نے انگریزی تعلیم کے حوالہ سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی تھی، پادری اسلام اور شارع اسلام پر حملے کرنے لگے اور اسلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں عیسائی تعلیمات کی فوقیت بیان کرنے لگے۔ ان حالات سے متاثر ہوکر حضرت قطب ویلور براہ راست انگریزی زبان میں موجود عیسائی لٹریچر کا تحقیق نظر سے مطالعہ کیا اور عیسائیوں کی انگریزی کتابوں سے تقریباً تین سو تناقص افکار اور قضاد آراء کی نشاندہی کی، اور اپنے تحقیقی مطالعہ کا نچوڑ اور مواد عیسائی مشنری کے ذمہ داروں اور پادریوں کی خدمت میں بھیجا تو عیسائی علماء اور فضلاء حیران اور ششدر رہ گئے اور ان سے کوئی جواب بن نہ سکا۔ آپ کے نامور خلیفہ رشید وشاگرد حضرت مولانا شاہ

عبدالحی واعظ بنگلور نے اپنی مثنوی مطلع النور میں حضرت قطب ویلور کی اس خدمت کی نشاندھی ان اشعار میں کی ہے۔

عیسوی دین کے کتب اے ذکی — جو کہ ہیں در زبان انگریزی
کر کے ان کا مطالعہ اکثر — جرح کرنے لگا بہت جا پر
تا حدے کہ وہ نکو منوال — تین سو تناقص اس سے نکال
تین سو اعتراض بھی لکھا — دیکھ حیراں ہو گئے علماء

حضرت قطب ویلور کے علاوہ حضرت مولانا قاضی نظام الدین احمد صغیر اور کئی علماء نے عیسائیت کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ مولانا یوسف کوکن عمری نے اپنی کتاب قاضی بدرالدولہ میں لکھا ہے کہ

''قاضی نظام الدین صغیر مدراسی نے عیسائی مبلغین کی بڑھتی ہوئی تبلیغی قوت کو دیکھکر محسوس کیا کہ عربی توراۃ اور انجیل کا فارسی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ مسیحی دین کی حقیقت سے عوام وخواص واقفیت حاصل کرسکیں۔ چنانچہ قاضی صاحب موصوف نے یہودیوں اور عیسائیوں کی تردید کے لئے ۱۸۴۰ء میں عربی زبور کا ترجمہ فارسی میں ۵۶۲ صفحات پر کیا۔ جس کا نام سرور الصدور ترجمۃ مغرب الزبور رکھا۔ پھر اس کے بعد آپ نے عربی انجیل کا ترجمہ فارسی میں فیض الجلیل فی ترجمۃ الانجیل کے نام سے کیا، تا کہ عوام وخواص بھی براہ راست ان کتابوں کو پڑھکر مبلغین کی دروغ گوئی اور افتراء پردازی سے کماحقہ آگاہ ہو جائیں''۔

حضرت قطب ویلور کے فرزند ارجمند شمس العلماء مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری علیہ الرحمۃ نے ۱۳۰۲ھ میں اپنے جد اعلیٰ حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری (متوفی ۱۱۴۹ھ) کی قائم کردہ شخصی وخانقاہی درسگاہ کو نشاۃ ثانیہ سے ہم کنار کیا اور اس میں درس نظامیہ کی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم کا نظم ونسق قائم کیا۔ حضرت رکن الدین نے زمانہ اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی میدان میں بڑی مفید اور عظیم اصلاحات کیں اور مدرسہ لطیفیہ میں مختلف علوم وفنون اور انگریزی تعلیم کا انتظام کیا اور جب طلباء کی پہلی جماعت فارغ ہوئی تو آپ نے ایک عظیم الشان جلسۂ بنائے عمارت مدرسہ لطیفیہ وتقسیم اسناد بتاریخ ۱۹ شعبان ۱۳۱۱ھ روز شنبہ مقرر کیا جس میں علماء وفضلاء مشائخ وصوفیہ امراء ورؤسا اور عوام کی بھاری اکثریت شریک رہی۔ اس تاریخ ساز اجلاس کے موقع پر حضرت رکن الدین کے علاوہ حضرت مولانا سید محمد فخر الدین مخزی، حضرت مولانا سید شاہ درویش پیر قادری میسوری، حضرت مولانا ابوالفضل سید شاہ محمد نظام الدین نقوی قادری مخزی، حضرت مولانا منشی غلام محمود مہاجر مدراسی، حضرت مولانا شاہ محمد ولی اللہ قادری شاہنوری، اور حضرت مولانا محی الدین چندہ حسینی وغیرہ کے فکر انگیز اور پر مغز خطابات ہوئے، اور طلبائے فارغین کی صلاحیت سے بھرپور تقاریر ہوئیں۔ اس جلسہ کی روئیداد اور دار العلوم لطیفیہ کی تعلیمی رپورٹ اور مستقبل کے تعمیراتی منصوبوں سے متعلق ایک تفصیل رپورٹ روداد جلسۂ دستار بندی وجلسہ بنائے عمارت مدرسہ لطیفیہ کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ اس اجلاس میں حضرت رکن الدین کے ولولہ انگیز اور فکر خیز اور تعلیمی واصلاحی خطابات ہوئے، آپ کی پرزور تقریر آپ کی زمانہ شناسی اور لطیف جذبات، پاکیزہ احساسات، روشن خیالات اور تعمیری اقدامات کی آئینہ دار ہے۔

ارباب مجلس! کیا ہماری طبیعتوں میں یہ جوش اسلام نہیں ہے کہ افلاس اور بے علمی کی مہلک بیماری کی مریض قوم کو صحت وتندرست بنائیں، اور کیا ہم کو اپنے مسلمانوں کی افسوس ناک حالت پر توجہ ونظر نہیں ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت کی خبر گیری ہر وقت کرتے رہیں، اور کیا

ہمارے میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اسلام کے، بجھتے ہوئے چراغ کو روشن اور منور کریں، اس مقام میں مدرسہ کی عمارت نہایت ضروری ہے طالب علموں کا ایک ہی مقام پر رہنے اور پڑھنے سے ان کے اندر علم کا شوق بڑھتا ہے۔ اور طلبا کے لئے طریقہ تعلیم میں جہاں تک ہو سکے، یہ بات مدنظر رکھنا چاہئے کہ ایک مدت معینہ میں ان کو تمام علوم سے فارغ کرادیں۔ اور طلباء کے لئے بھی ایک معینہ انگریزی میں دینی تعلیم کی تحصیل ہو جائے اور انگریزی میں بھی اس درجہ تک پہنچائیں کہ جہاں سے اور ترقی کرنے کے لئے ان کی عمر مکلفہ ہو۔ اس طریقہ تعلیم سے ہر خیال کے لوگ نفع اٹھائیں گے۔

طلباء کے لئے ایک دارالفنون قائم کریں تا کہ ہمارے بھائیوں کی اولا درزقِ حلال کا ذریعہ پیدا کرلیں۔ اور دینی علم کے ساتھ ہنر سے بہرہ ور ہو جائیں۔ اس دارالفنون میں ایک پریس مطبع بھی رہے، علم سکھلانے میں حاضرین کو فیض پہنچتا ہے۔ لیکن کتابوں کے طبع کرانے میں علم کا فیض نزدیک اور دور اور حاضر و غائب سب کو بآسانی پہنچے گا۔ مدرسہ میں ایک حکیم بھی ایسا رکھنا چاہئے جس کو یونانی اور انگریزی طبیات سے بھی واقفیت ہو، اور وہ طبیب طلباء کو فن طب کے ساتھ اس علم کی تعلیم دیا کرے تا کہ وہ لڑکے اس علم کو سیکھیں روزی بھی پیدا کرلیں اور لوگوں کو بھی نفع پہنچائیں۔

مدرسہ میں ایک کتب خانہ بھی رہنا ضروری ہے جس میں ہر قسم کے کتب موجود ہوں تا کہ طلباء کو بروقت کتب اور شروحات کے دیکھنے میں دشواری نہ ہو۔ تعلیم انگریزی درجۂ کفر تک پہنچاتی ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ وہ بھی ایک زبان ہے، معتدد زبانوں کا سیکھنا اور اس میں کمال پیدا کرنا کمالاتِ انسانی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے ملکی بود و باش کے لحاظ سے اور معاشی امورات کے سرانجام دینے اور اظہارِ مطالب اور حوائج کی غرض سے۔ اور ہمارے دین اسلام پر حملوں کے دفاع کی نیت سے انگریزی تعلیم بری نہیں، بلکہ نہایت ضروری ہے۔ علم کیا ہے انسان کا موروثی متاع ہے، علم نہیں تو میراث نہیں، علم نہیں تو دولت نہیں، علم نہیں تو دنیا نہیں، علم نہیں تو آخرت نہیں، علم وہ ہے جو آدمی کو پستی سے اوج پر لاتا ہے، میں امید رکھتا ہوں کہ حسن مصرف اور کمال استحقاق حصول ثمرات اور حسناتِ بے نہایت پر نظر کر کے فقیر کے ان اظہارات کو مستحسن و مقبول کریں گے اور ہر طرح سے مستعد ہوں گے۔

اس اجلاس میں جنوبی ہند کے مایہ ناز زمانہ شناس علمی شخصیت حضرت رکن الدین کے معتمد خاص اور رفیق معاون حضرت مولانا سید محمد فخر الدین فخری مہکری نے بھی خطاب کیا، صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

میں آپ بزرگوں کی خدمات میں کوئی نئی بات عرض کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ جو کچھ شمس العلماء مولوی سید شاہ محمد رکن الدین ابھی ارشاد فرمایا ہے اس کی تاعید میں کچھ عرض کروں گا۔ معزز حضرات جس طرح دینی علم کا حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح دنیوی علم کا جاننا بھی لازم ہے۔ دنیوی علوم وفنون کے حاصل کرنے میں ہمیں زمانہ کے رفتار اور زمانہ کی ضرورتوں کو بھی نظر رکھنا چاہئے۔ علوم وفنون کو زمانے سے لازمی نسبت اور خصوصیت ہے، آج کل ہم کو اور ہماری اولاد کو دینی علم کے علاوہ دنیوی علم کا جاننا اشد ضروری ہے جسکا زمانہ میں رواج ہے اور جس کو جانے بغیر انسان کے دینی اور دنیوی فرائض پورے ادا نہیں ہو سکتے۔

اگلے زمانے میں ان قوائد اور اصول پر جو علوم پڑھائے جاتے تھے اب وہ اصول وقوائد غیر مفید اور ناکارہ ہو چکے ہیں، اب ان کے قوائد واصول دوسرے ڈھنگ سے مرتب ہو چکے ہیں جس طرح دنیوی علم کے فروغ کو زمانے کے ڈھنگ اور رواج کو قوائد اور اصول کے

مطابق جاننا اور حاصل کرنا لازم ہے اسی طرح فنون کا سیکھنا اور سکھانا بھی لازم ہے۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم بقدر ضرورت واجب ہے ، فی زمانہ (اس دور میں ) انگریزی جانے بغیر دنیا کے کاروبار نہیں چلتے جب تک یہ طلباء انگریزی نہیں جانیں گے دنیا کے سامنے اسلام پیش نہیں کرسکتے ، پھر وہ بھاری کام نشر اسلام کا ہاتھ نہ آئے گا، جس کے طفیل میں ہمیں خیر امت کا تمغہ ملا ہے۔ آپ بزرگوں کو یہ ترغیب دیتا ہوں کہ جس طرح ہمارے طلباء مشرقی علوم میں کامل مہارت حاصل کر کے تحصیل (مولوی عالم ) کی سند لیتے ہیں ایسے ہی مغربی علوم میں انہیں اعلیٰ درجہ کی سند دلائی جائے۔ اور موجودہ زمانے میں ایسے ہی طالب علموں کی سخت ضرورت ہے جو مشرقی اور مغربی علوم میں کامل نصیبہ حاصل کیئے ہوں۔ تعلیم سے بہت لوگ غلطی کر کے فقط مردوں کی تعلیم مراد لیتے ہیں، یہ ان کی سراسر غلطی ہے، علم معاد اور علم معاشیت کی ذمہ داری میں مرد عورت دونوں برابری کا حق رکھتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ مرد علم کے زیور سے آراستہ ہوں اور عورت محروم رہے، ہم اسلامی تاریخ سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اگلے زمانے میں عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔

حضرات میں اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے ایک مختصر نصیحت ان سند یافتہ طلباء کو کرنا چاہتا ہوں۔ اے گلستان علم وفضل کے نونہالو! اپنی فضیلت کے جامہ کو آپس کے اختلاف کے کشمکش میں تار تار اور برباد نہ ہونے دیں ، جزوی اور فروعی اختلاف میں ہرگز نہ پھنسیں، سب مسلمانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھیں، آپ کی دعوت الی الحق خواہ تحریری ہو یا تقریری حکمت اور موازیت کے حدود سے باہر نہ ہو، آپ کی سعی ہمیشہ مسلمانوں میں اتحاد واتفاق قائم کرنے میں مبذول رہے۔ آپ کی ہمت ہمیشہ اسی میں صرف ہو کہ اسلام اور اسلامیوں کی ترقی ہو۔

یارب تو ہمیں علم دے جاہ و فر دے
تہذیب دے اخلاق دے مال و زر دے

سیاق میں حضرت قطب ویلور کا انگریزی زبان میں دعوت اسلامی کا فریضہ انجام دینے اور انگریزی زبان میں موجود اسلام مخالف لٹریچر کا بالراست مطالعہ کرنے اور اسلام کا دفاع کرنے کی سراحت کی گئی ہے۔ نیز صاحبزادہ حضرت قطب ویلور حضرت رکن الدین اور ان کے ہمنوا اور ہم فکر مولانا فخر الدین فخری مہکری مدراسی کے بعض خیالات کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں دین مدارس کے طلباء کے لئے انگریزی کا جاننا واجب قرار دیا گیا ہے، تاکہ وہ دنیا کے لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرسکیں، اور وہ پریس سے منسلک رہیں اور سب مسلمانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھیں اور جزوی وفروعی اختلافات کو ہوا نہ دیں اور عورتوں کو دینی اور دنیوی تعلیم دونوں سے آراستہ کریں اور دعوت واصلاح کے کام کو حکمت اور نصیحت کے حدود سے باہر نہ لے جائیں اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنی زمانہ شناسی کا ثبوت دیں۔

حاصل کلام ! موجودہ وقت ایسی ہی باتوں ،ضرورتوں اور تبدیلیوں کا متقاضی ہے جو آج سے قریباً دوصدی پہلے خانوادۂ حضرت قطب ویلور کے بزرگانِ کرام اور ان سے وابستہ علمائے عظام نے مدرسۂ لطیفیہ کے فارغین طلباء ۱۳۱۱ھ کے سامنے رکھی تھی۔ ماضی قریب کے اس پیغام کو ضرورت اور افادیت آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔

وما علینا الا البلاغ

# جواھر القرآن

ازمولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی
یم اے پی ایچ ڈی، استاذ دار العلوم لطیفیہ، ویلور

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ

سورۂ بقرہ کی زیر تفسیر آیت کریمہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا تذکرہ ہے، حضرت جبرئیلؑ فرشتوں کی جنس سے ہیں، فرشتہ کو عربی زبان میں ملک کہا جاتا ہے اور اس کی جمع ملائکہ ہے، فرشتے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور انکی تخلیق نور سے کی گئی ہے، انکی سرشت وفطرت میں صرف پاکیزگی اور طہارت رکھی گئی ہے، گندگی اور خباثت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں طاعت ہی طاعت انکی طبیت ہے، اور یہ غیر مادی ذی روح مخلوق ہے، اس کے مقابلہ میں انسان مادی مخلوق ہے اس کے اندر خواہشات، جذبات اور اختیارات ہیں جس کے باعث انسان سے طاعت وعدم طاعت، نیکی وبدی اور خیر وشر دونوں کا ظہور ہوتا ہے، فرشتوں کے اندر خواہشات جذبات، احساسات اور اختیارات جیسی انسانی خاصیتیں نہیں ہیں، فرشتوں کو خالق وباری تعالیٰ جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اسی حکم کی تعمیل میں مصروف اور مشغول رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کائنات کا نظام سنبھالے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات اور احکامات سے انہیں آگاہ اور مطلع فرماتا ہے اور وہ ان احکام کو محکوم بے اختیار بن کر کائنات میں جاری کرتے ہیں اور اپنے فرائض اور اعمال کی ادائیگی میں اپنی حد سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا وہ ایک الٰہی مشین ہے جس کے سارے پرزے اسی مزاج اور منہاج پر کام میں لگے ہوئے ہیں جن کو قدرت نے فٹ کیا ہے انسان کی زندگی کے ساتھ فرشتوں کا رشتہ نہایت قدیم ہے اور یہ رشتہ انسان کی تخلیق کی شروعات کے وقت سے قائم ہے، اور اس کا آغاز نوع انسان کے اولین فرد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیھا السلام کی ذات سے ہوا، پھر ان دونوں سے دنیا میں نسل انسانی کا سلسلہ جاری وساری ہوا جو صبح قیامت تک چلتا رہے گا اور ہر پیدا ہونے والے انسان کا اولین رابطہ فرشتہ ہی سے قائم ہوتا ہے، اور یہ تعلق اور ربط اس وقت قائم ہوتا ہے جب بچہ اپنی ماں کے رحم میں ہوتا ہے چنانچہ امام بخاریؒ کی روایت کتاب بدء الخلق سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کے رحم پر ایک فرشتہ کو مقرر کرتا ہے جو بچہ کی پیدائش سے پہلے اس کی تقدیر سے متعلق چند امور زندگی کی مدت، رزق، اس کا نیک یا بد ہونا وغیرہ رقم کرتا ہے، فرشتوں کا تعلق انسان کی زندگی کی شروعات سے لے کر اس کی موت بلکہ موت کے بعد قبر کی زندگی میں پھر قبر سے میدان حشر کی زندگی میں پھر جنت اور دوزخ کی دائمی زندگی میں داخل ہونے تک قائم ودائم رہتا ہے۔

انسان کی زندگی کے مختلف مراحل اور مختلف منزلوں میں جن فرشتوں کو جو جو کام سپرد کئے گئے ہیں وہ ان کو انجام دیتے ہیں ایک فرشتے کے دائرۂ عمل میں دوسرے فرشتے کی مداخلت نہیں ہوتی، جس کے ذمہ جو کام سونپ دیا گیا ہے وہ صرف اسی کام میں مصروف رہتا ہے، فرشتہ نیکی کا منبع اور مصدر ہے اور شیطان بدی کا منبع اور مصدر ہے خیر اور شر یہ دونوں طاقتیں انسان کے دل سے پیوست ہیں ایک حدیث شریف کے مطابق ہر آدمی کے دل کے سیدھے جانب فرشتہ ہوتا ہے اور دل کے بائیں جانب شیطان ہوتا ہے، فرشتہ آدمی کے دل میں نیکی کے جذبات کو بیدار کرتا ہے تو شیطان آدمی کے دل میں بدی کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے، فرشتہ کی جانب سے خیر کی ترغیب وتحریک ہوتی ہے اور شیطان کی جانب سے شر کی ترغیب وتحریک ہوتی رہتی ہے، آدمی کے دل میں خیر کا جذبہ غالب ہوگیا تو اس کے ہاتھ سے نیک عمل صادر ہوتا ہے اور اگر شر کا جذبہ غالب ہوگیا تو اس کے ہاتھ سے برا عمل صادر ہوتا ہے۔ فرشتے آدمی کی نیکی اور بدی لکھنے پر مامور ہیں، چنانچہ قرآن کریم کا بیان ہے: وان علیکم لحفظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون۔ بے شک تم پر فرشتے نگہبان اور نگران

ہیں، اور وہ سراپا نیک ہیں، تم جو کچھ کرتے ہو، اسکو وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں،

اس طرح سے وہ انسان کی پوری زندگی کا ایک ریکارڈ محفوظ کر دیتے ہیں اور جب آدمی کی زندگی کی مقررہ مدت مکمل ہو جاتی ہے تو یہی فرشتے اس کی روح کو بدن سے نکال دیتے ہیں اور یہ اس کی دنیاوی زندگی کی شام ہے تو نئی دائمی زندگی کی صبح ہے ۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے     یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

موت کے بعد آدمی کی دوسری زندگی زیر زمین شروع ہو جاتی ہے جس کو برزخی زندگی اور حیات اخروی کہا جاتا ہے، انسان کی زیر زمین زندگی میں بھی فرشتوں کا عمل اور دخل رہتا ہے چنانچہ احادیث کی رو سے قبر میں دو فرشتے پہنچتے ہیں جن کو منکر نکیر کہا جاتا ہے اور یہ صاحب قبر سے پوچھتے ہیں تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اور تمہارے نبی کون ہیں؟ آدمی یہ جواب دے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے، میرا دین اسلام ہے،

میرے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو فرشتے اسے ثواب اور رحمت سے نوازتے ہیں اگر آدمی یہ جواب نہ دے تو اسے عذاب دیتے ہیں،

دنیا کے خاتمہ پر آدمی اپنی قبر سے نکل حشر کے میدان میں پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے فرشتے ان کی زندگی کے اعمال کا دفتر پیش کرتے ہیں اور وہ آنکھوں دیکھ لیتا ہے اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں اور پکار اٹھتا ہے مالھذا الکتب لا یغادر صغیر ۃ ولا کبیر ۃ الا احصھا ۔ یہ تو بڑی عجیب کتاب ہے جس میں ہماری چھوٹی سی چھوٹی نیکی بھی درج ہے اور چھوٹا سے چھوٹا گناہ بھی درج ہے، پھر یہی فرشتے ترازو میں آدمی کے اعمال تولنے لگتے ہیں والوزن یومئذن الحق فمن ثقلت موازینہ فاؤلئك ھم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولئك ھم الخسرون ، نیکیوں کا پلہ وزنی رہا تو وہ کامیاب و کامران رہے گا اور اگر گناہوں کا پلہ ہلکا رہا تو وہ آدمی ناکام اور نامراد رہے گا، پھر فرشتے آدمی کو اس کے نیک اعمال کی بنیاد پر سلامتی و مبارک بادی دیتے ہوئے جنت میں پہنچا دیتے ہیں، اور وہ آدمی جس کے اعمال برے ہونے کی بنیاد پر یہ کہتے ہوئے دوزخ میں پہنچا دیتے ہیں کیوں صاحب تمہارے پاس اللہ کے پیغمبر نہیں آئے، وہ تم تک اللہ کی ہدایت نہیں پہنچائے، اور وہ اللہ کے حضور پہنچنے کی بات نہیں کہی،

الغرض یہی فرشتے ہیں جن کی تحویل میں دنیا اور آخرت کی تمام تر کارروائیاں ہیں دنیا اور آخرت میں اللہ کی رحمت ان ہی کے ذریعہ نازل ہوتی ہے اور عذابات بھی ان کے ذریعہ نازل ہوتے ہیں، فرشتے لاتعداد ہیں ان میں سے چار فرشتے اپنے فرائض کے اعتبار سے معظم و محترم اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ایک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان سفیر ہیں اور اس کے پیغامات بے کم و کاست پوری امانت اور دیانت کے ساتھ ہر پیغمبر تک پہنچاتے ہیں، دوسرے میکائیل علیہ السلام ہیں جو اللہ کے حکم سے زمین پر بارش نازل فرماتے ہیں، تیسرے عزرائیل علیہ السلام ہیں جن کا نام ملک الموت ہے، آپ انسانوں کے بدن سے روح نکالتے ہیں اور چوتھے اسرافیل علیہ السلام ہیں جن کے صور پھونکنے سے دنیا و آسمان اور ان کے درمیان کی ساری چیزیں فنا ہو جاتی ہیں اور پھر ان ہی کے صور پھونکنے سے سارے انسان زندہ ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں پہنچ جاتے ہیں۔

تمام فرشتوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک اعزاز اور اکرام یہ ہے کہ جو انسان بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا اس کے لئے ضروری ہے کہ فرشتوں پر بھی ایمان لائے اور کسی بھی فرشتہ کا انکار نہ کرے، قرآن کریم میں حضرت جبرئیل کا ذکر مختلف زاویوں اور متعدد پہلوؤں کے ساتھ موجود ہے، ان کے تذکرہ میں ایک پہلو یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی پیغمبری اور صحیفہ موسوی پر ایمان رکھنے والوں نے حضرت جبرئیل کے ساتھ اپنی دشمنی اور ناراضگی کا اظہار کیا ہے چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۹۷ اور آیت نمبر ۹۸ میں موجود ہے : قل من کان عدوا الجبرئیل فانہ نزلہ علی قلبك باذن اللہ مصدقا لما بین یدیہ وھدی وبشری للمؤمنین ۔ من

کان عدواللہ وملئکتہ ورسلہ وجبرئیل ومیکٰل فان اللہ عدو للکفرین ۔اے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرمادیجئے جو جبرئیل کا دشمن ہو، (وہ اللہ تعالیٰ کا بھی دشمن ہے) جس ذات نے آپ کے قلب اطہر پر وہ پیغام اتارا ہے، جو پیغام (یہودیوں) کے پاس کی کتاب (توراۃ) کو سچا بتانے والا اور (تصدیق کرنے والا) اور اہل ایمان کو ھدایت اور بشارت دینے والا ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل ومیکائیل کا دشمن ہو، ایسے کافروں کا دشمن، خود اللہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوی جب یہودیوں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنا دشمن ظاہر کیا اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو اپنا دوست بتایا،

علامہ عمادالدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ درج ذیل تفصیل بیان کی ہے: یہودیوں کی ایک جماعت جو اہل علم پر مشتمل تھی، بارگاہ رسالت میں حاضر ہوی، آپ سے عرض کی، ہم آپ سے چند سوالات کے جواب چاہتے ہیں اور یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب وہی شخصیت دے سکتی ہے جو منصب نبوت پر فائز رہے، آپؐ نے فرمایا، جو سوالات چاہیں مجھ سے پوچھو میں ضرور جوابات دوں گا، لیکن مجھ سے اس بات کا وعدہ کرو کہ اگر وہ جوابات صحیح ہوں تو تم مجھے نبی تسلیم کروگے اور یہ عہد و پیمان حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح اللہ کی شہادت کے ساتھ ان سے پختہ وعدہ تھا، یہودیوں نے وعدہ کیا کہ اگر آپ کے جواب ٹھیک ہوں تو آپ کی نبوت کا اقرار کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوالات کرنے کی اجازت دی، چنانچہ علمائے یہود نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ بتائیے کہ توراۃ نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر کس چیز کو حرام کرلیا تھا؟ آپ نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کے مرض میں مبتلا ہوگئے تو آپ نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس بیماری سے شفا عطا فرمائے تو میں اپنی مرغوب ومحبوب کھانے اور پینے کی چیز چھوڑ دوں گا، جب آپ صحت یاب ہوگئے تو آپ نے اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا اور اونٹنی کا دودھ پینا چھوڑ دیا جو آپ کی بڑی پسندیدہ غذا تھی، تمہیں اللہ کا واسطہ اور اس کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی، سچ سچ بتاؤ کیا یہ جواب ٹھیک ہے؟ سب نے قسم کھا کر عرض کیا، ہاں حضور! یہ جواب ٹھیک ہے، سچ ہے، بجا ارشاد ہوا۔

یہودیوں نے دوسرا سوال کیا: عورت اور مرد کے مادہ منویہ کی کیا کیفیت ہے، کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی، اس کا سبب کیا ہے؟

آپؐ نے جواب دیا: مرد کی منی گاڑھی اور سفید ہوتی ہے اور عورت کی منی پتلی ورقیق اور پیلی زردی مائل ہوتی ہے، ان دونوں میں سے جس کی منی غلبہ حاصل کرلیتی ہے اسی کے مطابق پیدائش ہوتی ہے اور اسی کے مطابق شکل وصورت بھی ہوتی ہے، جب مرد کی منی عورت کی منی پر غالب آجائے تو اللہ کے حکم سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب آجائے تو اللہ کے حکم سے لڑکی پیدا ہوتی ہے۔

تمہیں اللہ کی قسم! سچ سچ بتاؤ میرا جواب صحیح ہے؟ سب نے اللہ کی قسم کھاتے ہوے عرض کیا کہ آپ نے صحیح کہا۔

پھر یہودیوں نے کہا، یہ فرمایئے کہ توراۃ میں جس امی نبیؐ کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اس نبی کی خاص نشانی کیا ہے، اور اس کے پاس وحی کس فرشتہ کے ذریعہ پہنچتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس نبی امی کی خاص نشانی یہ ہے کہ جب اس کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوں تو اس حالت میں بھی اس کا دل بیدار رہتا ہے، تمہیں اس رب کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی، بتایئے کہ کیا میرا یہ جواب صحیح ہے، سب نے بیک زبان ہوکر قسم کھاتے ہوئے عرض کیا، آپ کا جواب بالکل صحیح ہے،

اس سوال سے متعلق جڑے ہوے دوسرے سوال کا جواب دیجئے، اس پر سوالات ختم ہیں، آپ نے فرمایا: اس نبی امی کے پاس جو فرشتہ وحی لے کر پہنچتا ہے وہ میرا ولی جبرئیلؑ ہے اور وہی فرشتہ سارے نبیوں کے پاس وحی لے ہوے پہنچتا رہا، قسم کھا کر سچ سچ بتاؤ کہ میرا

یہ جواب بھی صحیح ہے؟ یہودیوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہاں! آپ کا جواب بالکل صحیح ہے لیکن جبرئیل ہمارا دشمن ہے وہ عذابات اور ہلاکتیں لے کر آتا ہے اس لیے ہم اس کو پسند نہیں کرتے، اسی جہت سے آپ کی نبوت کو بھی نہیں تسلیم کریں گے، اگر آپ کے پاس میکائیل وحی لے کر حاضر ہوتے تو ہم آپ کو پیغمبر تسلیم کرتے اور آپ کی فرماں برداری کرتے۔

کیونکہ میکائیل رحمت کے فرشتہ ہیں وہ بارش اور پیداوار لے کر آتے ہیں، وہ ہمارے رفیق ہیں یہودیوں کی جبرئیلؑ دشمنی پر مذکورہ آیت شریفہ نازل ہوی،

امام بخاریؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریمؐ جب مدینہ منورہ نور افروز ہوے تو اس وقت حضرت عبداللہ بن سلام اپنے باغ میں تھے اور وہ یہودی تھے، آپؐ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو بارگاہ رسالت میں حاضر ہوے اور آپؐ سے عرض کیا کہ میں آپ سے تین سوال کے جواب چاہتا ہوں اور یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا، یہ کہتے ہوے سوال کیا، یہ فرمائیے قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ اہل جنت کو کھانے پینے میں پہلی چیز کیا پیش کی جائے گی؟ اور بچہ لڑکا یا لڑکی پیدا ہونے وجہ کیا ہوتی ہے؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ابھی ابھی جبرئیلؑ تشریف لائے اور انہوں نے مجھے تینوں سوالوں کے جوابات سے مطلع کیا آپ سن لیجئے آپ ﷺ کا یہ کہنا ہی تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام بول اٹھے، جبرئیل تو ہمارا دشمن ہے،

اس وقت حضور اکرم ﷺ نے مذکورہ آیت: قل من کا عدواللجبرئیل الی آخرہ تلاوت فرمائی، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن سلام کے تین سوالوں کے جواب دیئے، پہلے سوال کا جواب، پہلی نشانی قیامت کی یہ ہوگی کہ ایک آگ ہوگی جو لوگوں کے پیچھے لگے گی، اور انہیں مشرق سے نکال کر مغرب کی طرف لے جائے گی،

دوسرا سوال کا جواب: اہل جنت کی پہلی ضیافت طعام میں مچھلی کی کلیجی ہوگی۔ تیسرے سوال کا جواب: مرد کی منی، عورت کی منی پر غالب اور حاوی ہوجائے گی تو لڑکا تولد ہوگا، اور اگر عورت کی منی، مرد کی منی پر غلبہ حاصل کرلے تو لڑکی پیدا ہوگی، جیسے ہی زبان نبوت سے عبداللہ بن سلام نے وہ تشفی بخش جوابات سن لئے جو کسی غیر نبی سے نہیں مل سکتے تھے، انہوں نے فوراً یہودی مذہب ترک کردی اور اسلام کی آغوش میں چلے آئے اور بلند آواز میں کہہ اٹھے: اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ میں گواہی دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں، اس کے بعد حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا، یارسول اللہ! عقل وفہم میں یہودی ناقص ہیں اگر ان لوگوں کو پہلے سے میرا اسلام قبول کرلینا معلوم ہوجائے تو وہ مجھے برا کہیں گے، آپؐ پہلے انہیں قائل کرلیجئے؟

اس گفتگو کے بعد کچھ یہودی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آپہنچے تو آپؐ نے ان سے پوچھا، تمہارے درمیان عبداللہ بن سلام کیسے آدمی ہیں، سب نے کہا، وہ بزرگ ہیں اور صاحب فہم شخصیت ہے، صالحین کی اولاد میں سے ہیں اور ہمارے رہنما اور سردار ہیں اور وہ سرداروں کی اولاد میں سے ہیں، یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا ایسے نیک دل آدمی عبداللہ بن سلام مسلمان ہوجائیں تو آپ لوگوں کو مسلمان ہونے میں کوئی تردد اور تامل تو نہ ہوگا؟

یہ سن کر کہنے لگے: اعوذ باللہ، اعوذ باللہ، وہ کیوں مسلمان ہوجائیں گے؟ حضرت عبداللہ بن سلام جواب تک چھپے ہوئے تھے سب کے سامنے آگئے اور زور زور سے کلمہ طیبہ پڑھنے لگے، یہ منظر دیکھ کر سارے یہودی شور مچانے لگے اور کہنے لگے، یہ تو خود بھی برا ہے اور اس کے باپ دادا برے لوگ تھے اور یہ نہایت کم ظرف نچلے درجہ کا آدمی ہے اور یہ خاندانی کمینہ شخص ہے، اس صورت حال کو دیکھتے ہوے عبداللہ بن سلام نے فرمایا، حضورؐ مجھے اسی بات کا خدشہ تھا، اس روایت سے یہودیوں کی تلون مزاجی اور اسلام دشمنی پوری طرح نمایاں ہورہی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

# جواھر الحدیث

مولوی حافظ ڈاکٹر ابوالنعمان بشیرالحق قریشی
یم اے پی ایچ ڈی استاذ دارالعلوم لطیفیہ ویلور

## نحن معشر الانبیاء لانرث درھما

نبی کریمؐ نے فرمایا نحن معشر الانبیاء لا نرث درھما ولا دینارا۔ ہم گروہ انبیاء سے ہیں ہم درہم ودینار اور زر وزمین کے وارث نہیں ہوتے، انسانوں میں انبیائے کریم ہی کی وہ مقدس جماعت ہے جن کی میراث صرف علم ہے، ان کی اولاد کو وراثت میں جو چیز ملتی ہے وہ صرف علم اور ان کی پاکیزہ خصلتیں اور عادتیں ہیں جو خاندان اور خون کے اثرات کے باعث ان کی اولاد میں منتقل ہوتی ہیں۔ الولد سر لابیہ۔ بیٹا باپ کی صفات وعادات کا مظہر ہوتا ہے، علم اور پاکیزہ سیرت یہی دو چیزیں نبیوں کی میراث ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے انبیائے کرام کے علوم ومعارف کو اخذ اور قبول کا فطری ملکہ اور ان کی پاکیزہ خصلتوں اور عادتوں کا طبعی مادہ، نبیوں کی اولاد میں ودیعت فرماتا ہے اور عموماً یہ چیزیں وراثت کے طور پر نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہتی ہیں، آنحضرت ﷺ کی میراث علم اور میراث خلق کا وافر حصہ اہل بیت کی اصل اور جڑ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہ اور حضرت فاطمہؓ کو ملا، پھر ان کے دو صاحبزادے حضرات حسنینؓ اس متاع علم اور دولت خلق عظیم کے وارث ہوئے، پھر حضرات حسنینؓ کی اولاد اور احفاد میں علم کا وہبی ملکہ اور اخلاق فاضلہ کا جوہر واسطہ در واسطہ منتقل ہونے لگا، خانوادۂ نبوت کی آنے والی نسل اس وراثت کی حامل اور مظہر بنتی چلی گئی، اور ان کے اخلاف، اسلاف کے نقش قدم پر چلتے رہے، ان حضرات کی خوش خلقی، اعلیٰ ظرفی، وسعت نظری، بصیرت قلبی، قوت علمی، طاقت روحانی، اور خدمت علمی وعملی سے ہر دور اور ہر علاقہ کے مسلمان متاثر ہوتے رہے اور انکی جانب مائل اور متوجہ رہے، امت کا سواد اعظم اہل بیت کے علماء ومشائخ سے تعلیم اور تزکیہ کی راہ سے وابستہ اور منسلک رہا اور اس میں تاریخی تسلسل اور تواتر کی شان رہی۔

واقعہ کربلا کے بعد اہل بیت کے افراد نے خلافت وامارت کے حوالے سے خود کو الگ کرلیا، صرف دو یا تین اشخاص نے خلافت کی جانب توجہ مبذول کی لیکن ان کی کوششیں بھی بارآور ثابت نہیں ہوئی، ایک حضرت زیدؒ ہیں جو امام حسینؓ کے پوتے ہیں، اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں آئے اور شہید ہوگئے، اور دوسرے محمد بن عبداللہ المعروف نفس ذکیہ ہیں جو امام حسن کے پوتے ہیں، عباسی خلیفہ منصور کے مقابلے میں آئے اور یہ بھی شہید ہوگئے، اس کے بعد اہل بیت نے کلی طور پر خلافت کے مسئلہ سے دامن جھٹک لیا۔

اس فکری انقلاب اور عملی اقدام کا خوش آئند پہلو یہ سامنے آیا کہ اولاد علیؓ امن اور سکون کے ساتھ اپنے تمام تر توجہ درس وتدریس دعوت وتبلیغ، تزکیہ وتطہیر، غیر سیاسی بیعت وخلافت کی طرف مبذول کی، دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے اور وسیع پیمانے پر رشد وہدایت کا کام شروع کیا جس کی وجہ سے تزکیہ اور احسان کی دنیا میں بڑا وقیع اور عظیم الشان کام ہوا اور اس کے دوررس اثرات صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اہل بیت کے علماء اور مشائخ سے کئی ایک روحانی سلاسل جاری ہوئے اور تصوف کے اشغال اور طریقے رائج ہوئے اور ہر سلسلہ سے نہ صرف عوام بلکہ وقت کے جلیل القدر علماء، وفضلا فقہاء اور محدثین بھی وابستہ اور منسلک رہے۔ ہزاروں خانقاہیں اور درسگاہیں وجود میں آئیں، بیعت وخلافت کا ایک عالم گیر مضبوط نظام قائم ہوا، تاریخ کے ہر دور میں ہر شیخ طریقت کے ہزاروں تلامذہ اور خلفاء کے ذریعے کتاب وسنت کی تعلیم وتزکیہ نفوس اور تطہیر قلوب کا کام انجام پاتا رہا اور چراغ سے چراغ جلتے رہے اور ہر سو روشنیاں بکھرتی رہیں، ظلمت وتیرگی ختم ہوتی چلی گئی، مفکر اسلام سید شاہ ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''المرتضیٰ'' میں اس موضوع کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے آپ بھی سنئے:

''خانوادہ نبوت کے چشم وچراغ افراد کی (خواہ ان کا تعلق حسنی شاخ سے ہو یا حسینی شاخ سے) اسلام کے پھیلانے میں گراں قدر خدمات ہیں اور ان خدمات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا، انکے ذریعہ اسلام ان ملکوں اور علاقوں تک پہنچا، جہاں کبھی اسلام کا نام بھی نہیں سنا گیا تھا، لاتعداد خلق خدا نے اسلام قبول کیا اور ان ملکوں میں ابتدا ہی سے اسلام کی جڑیں مضبوط ہوئیں وہاں، اور اسلام کا شجرہ طیبہ اب تک بارآور اور ثمرآور ہے۔ مغرب اقصیٰ کے بربر (جو نا قابل تسخیر سمجھے جاتے تھے) انہیں سادات کرام کے ہاتھوں پر ہزاروں کی تعداد میں مشرف با اسلام ہوئے۔

اسی طرح جنوب مشرقی ایشیاء میں اور جزائر انڈونیشیاء میں اسلام پھیلانے میں نمایاں اور بڑا حصہ سادات کا ہے (ص ۳۹۳)
سراواک کی تاریخ میں مذکور ہے کہ سلطان برکات علیہ الرحمہ حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کی ذریت میں سے تھے حضرموت کے حسینی

سادات بحری تجارت کرتے تھے اور انہوں نے اسی آمدورفت میں وہاں کے لوگوں میں اسلام پھیلایا۔

برصغیر ہند کے علاقہ کشمیر میں (جہاں آج بھی بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے) اسلام کی اولین دعوت دینے والے مبلغ اعظم امیر سید علی شہاب ہمدانی تھے۔ امیر سید علی ہمدانی اسماعیل بن علی بن محمد بن علی بن حسین کی نسل سے تھے۔ ۷۷۳ھ ہجری میں کشمیر آئے اور ان کے ہاتھوں پر وہاں کی اکثر آبادی اسلام میں داخل ہوی، یہ بات بھی تاریخی لحاظ سے ثابت شدہ ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کے تمدن وتہذیب اور اسلامی آداب وفنون کا رواج انہیں کی آمد کے بعد ہوا، اور بڑے بڑے علماء کے ظہور کا سہرا سید علی الھمدانی ہی کے سر ہے۔

سادات کرام میں خاصی تعداد ان عظیم المرتب روحانی مربیوں کی ہے، جنھوں نے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن، بندگان خدا کے اندر فکر آخرت پیدا کرنے ان کو اللہ سے جوڑنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور توجہات صرف کردیں، جن کی سعی اور توجہ سے خدا کے ہزاروں بندوں کو تقوی ، رجوع الی اللہ اور اتباع سنت کی سعادت وتوفیق ملی، خواہشات نفسانی کی غلامی سے آزادی اور انانیت وتکبر کے امراض سے رہائی نصیب ہوئی، دعوت الی اللہ کے میدان میں ان مشائخ وصوفیہ کے کارہائے نمایاں ہیں۔

حضرت حسن وحسینؓ سے نسبی تعلق رکھنے والے بے شمار اہل اللہ جزیرۃ العرب ہی میں نہیں، برصغیر ہند میں بھی ہوئے ہیں، جنہوں نے بندوں کا تعلق اللہ تعالی سے جوڑا، دلوں کے زنگ دور کئے، نفس وشیطان کے شر سے تحفظ کے گر سکھلائے، ہزاروں بندگان خدا کو راہ حق پر گامزن کیا، انکے ذریعہ روحانیت ونورانیت عام ہوئی، ان خاصان خدا میں سے خواجہ نظام الدین محمد ابن احمد بدایونی دہلی (مشہور بہ سلطان المشائخ محبوب الہی) اور ان کے خلیفہ اجل سید نصیر الدین بن محمود بن یحیٰی اودھی (معروف بہ چراغ دہلی) اور ان کے خلیفہ گرامی قدر حضرت سید محمد بن یوسف حسینی گلبر گوی (مشہور بہ خواجہ گیسو دراز) بھی، ہیں اور۔ ان سب حضرات کا نسبی طور پر سادا تحسنی اور حسینی میں ہونا تسلیم شدہ امر ہے۔ ان حضرات کے اثرات خانقاہوں کی محدود فضاؤں میں پھیلے ہوئے نہ تھے، عام زندگی، معاشرہ اور بازاروں تک محیط تھے۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف، شیخ الاسلام رکن الدین سے ایک دنیا ان کے انفاس متبرکہ سے روشن ہوئی، اور ایک عالم نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کی مدد سے گناہ گاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں نے بدکاری سے کنارہ کش ہوگئے اور بے نمازیوں نے قضا نمازوں سے ہاتھ اٹھالیا اور ہمیشہ کے لیے پابند نماز ہوگئے۔

عہد علاؤالدین کے آخری چند سالوں میں شراب، فسق وفجور جوا، فاشی وغیرہ کا نام بھی اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سودخوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فن سلوک اور عبادت وریاضت کے بلند مقام پر فائز تھے، سنت کے سخت پابند، خلق خدا کو اللہ تعالی کی طرف بلانے والے، نفع وافادۂ عام میں مشغول، زہد وتوکل میں بے نظیر تھے۔

گلبرگہ کے سید عالی مقام حضرت سید محمد بن یوسف خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، جو اپنے وقت کے امام طریقت، عالم جلیل، فقیہہ وزاہد، رہنمائے راہ سلوک تھے، علم روایت اور درایت میں اہل علم ان سے رجوع کرتے تھے اور اصلاح نفس، تزکیہ باطن میں حق پر گامزن ان کے فیض سے مستفیض رہتے تھے اور عام بندگان خدا راہ حق پر چلنے کے لئے ان ہی کا دامن تھامتے تھے۔

ان ہی میں علامہ سید اشرف ابراہیم سادات حسنی وحسینی تھے جو سید جہانگیر اشرف کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سمنان میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے زیر سایہ دولت وثروت اور ناز ونعمت میں شاہانہ انداز میں پروان چڑھے، اپنے والد کی جگہ پر تخت نشین ہوئے، حکومت کی ذمہ داریاں بھی پوری ادا کرتے تھے اور اس کے ساتھ علمی اشتغال بھی جاری رکھا، شیخ رکن الدین سمنانی اور دوسرے علماء ومشائخ عصر سے اکتساب فیض کیا، پھر تخت حکومت سے دست بردار ہوکر ہندوستان کا قصد کیا اور کچھوچھہ میں قیام فرمایا اور تربیت نفوس اور اصلاح باطن اور دعوت الی اللہ کے کاموں میں مشغول رہے، اللہ نے ان کے ہاتھوں ہزاروں کو ایمان نصیب کیا۔

ان جلیل القدر علم برادران دعوت وعزیمت میں حضرت سید آدم بنوری بھی ہیں (جو نسباً حسینی کاظمی سادات میں ہیں) ان سے لاتعداد خلق خدا فیض یاب ہوئی، کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر چار لاکھ مسلمانوں نے اتباع سنت محمدیہؐ پر بیعت کی اور ایک لاکھ طالبین خدا ان کے ذریعہ علم و معرفت کے بلند مقام پر پہنچے، کہا جاتا ہے کہ ان کی خانقاہ کسی دن بھی ایک ہزار آدمی سے خالی نہیں رہتی تھی۔ اور سب کا کھانا آپ ہی کے لنگر سے آتا اور

سب یکسوئی کے ساتھ روحانی اور باطنی استفادہ میں مشغول رہتے، ۱۲۵۰ھ میں آپ لاہور تشریف لے گئے، دس ہزار مشائخ اور ہر طبقہ کے علماء وصوفیاء اس سفر میں آپ کے ہم رکاب تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر 40 ہزار سے زائد غیر مسلم مسلمان ہوئے اور 30 لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلہ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ روئے زمین پر جاری ہے اس سلسلے میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہوئے (المرتضی ص ۴۰۲، ۴۰۴، ۳۹۴)

یہ بڑی ناسپاسی اور شکر گذاری ہوگی کہ سادات کرام کے اہل علم اور ارباب تصوف اور اصحاب ولایت کی اشاعت اسلام کا ذکر کیا جائے اور ان کی تعلیمی تبلیغی اور اصلاحی مساعی جمیلہ کا ذکر کیا جائے اور اس خانوادے کی بات نوک زبان پر نہ لائی جائے جس کے چشمہ علم وعرفان سے یہ عاجز طالب علم سیراب ہوا۔ جنوبی ہند کا یہ وہ خانوادہ حسنی وحسینی سادات ہے جس نے تین سو سال سے سرزمین ویلور میں علم وتزکیہ کی شمع فروزاں کئے ہوئے ہے اس کی گراں قدر خدمات کا مفصل تذکرہ اس وقت ایک مشکل امر ہے لہذا خانوادہ عالیہ کے چند اکابر صوفیہ کے نام شمار کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس خاندان سادات کے ایک بزرگ حضرت شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری بارھویں صدی ہجری کے ربع ثانی میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیجاپور سے ویلور آپہنچے، حضرت قدس سرہ کے صاحب زادے حضرت مولانا سید شاہ ابوالحسن قربی قادری علیہ الرحمہ نے ۱۱۷۹ھ میں قلعہ ویلور کے شمالی حصے میں ایک خانقاہ تعمیر کی جس میں آپ قرآن وحدیث اور سلوک کی تعلیم دیتے تھے، آپ کثرت سے لوگوں کو مرید بناتے تھے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ لوگ حلقہ ارادت میں شامل ہوجائیں گے تو ان کے دلوں میں اس عہد کا احساس اور خوف رہے گا جس کی وجہ سے وہ غیر شرعی اور بدعتی افعال سے بچتے رہیں گے اور جھوٹ، حرام خوری، رشوت خوری، ریش تراشی، ترک نماز، لایعنی کاموں اور دیگر گناہوں سے بچتے رہیں گے اور اس کا مشاہدہ عام ہے۔

حضرت قربی اور ان کے فرزند ارجمند حضرت عبداللطیف ذوقی ویلوری صاحب ولایت وکرامات بزرگ تھے، دونوں کے قلم سے بے شمار علمی ودینی اصلاحی وعرفانی کتابیں صدور پذیر ہوئی ہیں، رفض وشیعیت اور بدعات اور خرافات کے خلاف دونوں نے علم جہاد بلند کیا۔

اس خانوادے کی کوہ پیکر علمی وعبقری شخصیت حضرت سید شاہ عبدالطیف نقوی قادری معروف بہ قطب ویلور قدس سرہ ہیں، عرب وعجم میں سات لاکھ سے زائد مسلمانوں نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی 400 سے زائد علماء فضلاء نے آپ سے خرقہ خلافت پہنا اور آپ نے انہیں مختلف دیار وامصار میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتزکیہ کے کام پر روانہ فرمایا۔

حضرت قطب ویلور نے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کی مہم شروع کی اور اس کام میں اپنے خلفاء کو ساتھ لیا، ارباب حکومت کو زبانی وتحریری ہر دونوں طریقوں سے دعوت دی، آپ کے زمانہ میں ہندوستان پر انگریز حکومت کر رہے تھے۔ آپ نے ملکہ برطانیہ اور اس کے وزراء کے نام دعوت اسلام کا مکتوب انگریزی زبان میں روانہ کیا۔ ملکہ برطانیہ نے آپ کے مکتوب کا جواب دیا جس میں لکھا کہ وہ چند وجوہ کے باعث اسلام قبول کرنے سے قاصر ہے مجھے اعتراف ہے کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میری حکومت میں ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کے حق کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

حضرت قطب ویلور نے کوئن وکٹوریہ کے علاوہ ہندوستان کے مختلف راجاؤں کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اپنے خلفا کو ان کی خدمت میں بھیجا، اپنے خلیفہ مولانا شاہ عبداللہ قادری کے نام ایک مکتوب لکھتے ہیں۔

دعوت اسلام کے مکتوبات دو طرح کے ہیں، راجاؤں کے نام اور تمام مشرکوں کے نام، راجاؤں کے نام تحریر کردہ مکتوبات میں خالی جگہ میں مدعو راجہ کا نام اور موضوع کا نام لکھیں اور دعوت نامے صاحب فراست اور ذی اخلاق عالم دین کے ذریعے راجاؤں کی خدمت میں کمال ادب اور احترام کے ساتھ پیش کریں، اور ہمیشہ خود کو اصلاح ودعوت کے کام میں مشغول رکھیں، اصل کام تو یہی ہے باقی سب ہیچ ہے۔

حضرت قطب ویلور کے علم وتحقیق اور دعوت اصلاح وتبلیغ کا ایک ممتاز پہلو یہ ہے کہ اس میں زمانہ شناسی کا عنصر ملتا ہے، آپ نے خود انگریزی زبان سیکھی اور خلفاء کو سیکھنے کی ترغیب دلائی، آپ نے ایک ایسے زمانے میں یہ اقدام کیا جب کہ علماء کی اکثریت انگریزی زبان سے متنفر اور دور تھی۔

اس خانوادے کے افراد کو 191 سلاسل طریقت میں خلافت واجازت کی نعمت حاصل ہے، اور یہ تمام سلاسل ایک کتاب میں جمع ہے جن کو حضرت سید شاہ ابوالحسن القادری بیجاپوری نے یکجا کیا ہے اور اسے مخزن السلاسل کا نام دیا ہے۔

اس خاندان سادات کی ایک اور اہم شخصیت حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری علیہ الرحمہ ہیں، آپ وسیع النظر، وسیع الخیال

اور وسیع المشرب عالم دین اور شیخ طریقت تھے۔آپ کے اندر گروہی عصبیت، جماعتی نفرت، مسلکی عصبیت اور اختلافی مسائل میں شدت نہ تھی، آپ مذہباً حنفی اور مشرباً قادری اور مزاجاً اعتدال پسند تھے اور تمام مکاتیب فکر کے علماء ومفکرین کے ساتھ عزت واحترام حسن اخلاق وحسن سلوک اور رواداری وسیر چشمی سے پیش آتے تھے، آپ کے روابط وتعلقات میں وسعت تھی آپ کے زمانہ میں دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسی دینی وعصری تحریکیں اور درسگاہیں وجود میں آئیں اور ان کے بارے میں بعض اہل علم افراط وتفریط اور تشدد وتعصب کا شکار ہوگئے لیکن حضرت رکن الدین نے اس باب میں بھی اپنا تعمیری مزاج وکردار اور اعتدال وتوازن کو برقرار رکھا آپ کے زمانے میں ندوۃ العلماء کی تحریک غلط فہمیوں اور شکوک وشبہات کی شکار تھی ایسے ماحول میں حضرت رکن الدین نے ندوۃ العلماء کی تائید اور حمایت کی جس کی وجہ سے خواص وعوام ندوۃ کی جانب مائل اور متوجہ ہوئے۔حضرت رکن الدین اپنی علالت کی وجہ سے ندوۃ العلماء کے دسویں اجلاس منعقدہ مدراس ۳، ۴، ۵، جنوری ۱۹۰۴ھ میں شریک نہ ہوسکے لیکن اپنے صاحبزادے حضرت مولانا مولوی سید شاہ عبد اللطیف قادری مکی علیہ الرحمہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مدراس بھیجا، صاحبزادہ والاشان نے ندوہ کے ایک اجلاس کی صدارت فرمائی اور خطبہ صدارت پیش کیا، سادات کرام کے اس خانوادہ کا ذکر جمیل مفکر اسلام سید شاہ ابو الحسن علی حسنی ندوی کی تحریر پر ختم کیے دیتا ہوں جو راقم الحروف کے ایک طویل تحقیقی مقالہ ’’تذکرۃ اقطاب ویلور‘‘ سے متعلق صادر ہوی ہے۔

صوفیاء کے مبارک سلسلوں میں ایک سلسلہ سادات ویلور کا ہے یہ سلسلہ جنوبی ہند میں تقریباً ۳۰۰ سال سے سرگرم خدمت ہے، اور اس میں تسلسل اور تواتر کے ساتھ علماء ومشائخ، اصحاب درس وتصنیف اور اہل کمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں بڑی جامعیت کے ساتھ اپنی علمی ودینی خدمات جاری رکھیں اور روحانی اشغال کے ساتھ ساتھ درس وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وارشاد اور اصلاح وتربیت کا کام انجام دیا۔

اس خانوادہ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی جامعیت ہے جس کے تحت اس نے شریعت وطریقت دونوں کا توازن برقرار رکھنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے اور ہر دور میں علم ودین اور عقل ودل کا خوش گوار امتزاج پیدا کیا، معتدل ومتوازن صوفی سلسلوں کی طرح اس صوفی خانوادے نے بھی اسلام کے عطا کردہ جامعیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی زمانہ شناسی کا ثبوت دیا ہے۔جس زمانے میں انگریزی تعلیم کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے تھا اس سلسلے کے علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس میں دعوتی کام انجام دیا، حضرت مولانا شاہ محی الدین سید شاہ عبد اللطیف ثالث نقوی (حضرت قطب ویلور) ۱۲۸۹ھ میں ملکہ وکٹوریہ کو اپنے مفصل مکتوب میں دعوت اسلامی دی۔

الغرض اہل بیت کے علماء ومشائخ کے ذریعہ ہند وبیرون ہند کے مسلمانوں میں تعلیم وتزکیہ اور غیر مسلموں میں تبلیغ ودعوت کی عظیم الشان اور گراں قدر مفید اور موثر سرگرمیاں رہی ہیں ان کا تاریخی تسلسل ہے جو کسی دور میں منقطع نہیں ہوا لیکن موجودہ زمانے میں سلسلۃ الذہب کی کڑیاں بکھرتی نظر آرہی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ سادات کے اکثر خانوادوں میں نئی نسل دینی تعلیم وتربیت اور اکابرین کی صحبت سے دور ہوتی جارہی ہے، اور اس کے اوپر خاندانی تعلیمی اور تربیتی گرفت ڈھیلی ہوتی جارہی ہے اور خاندان بکھرتے جارہے ہیں، بے آمیز سیادت خالصہ ختم ہوتے جارہی ہے۔اہل بیت کے علماء مشائخ میں یہ روایت تسلسل کے ساتھ چلی آتی رہی ہے کہ ان کی اولاد انکے آباؤ اجداد کی صحبت وتربیت اور تعلیم وتزکیہ سے بہرہ ور ہوتی رہی، بیٹا اپنے باپ کا شاگرد اور مرید اور باپ، اپنے باپ کا شاگرد ومرید، ہم چنیں مسلسل کا معاملہ اوپر تک چلتا رہا اور ان کے خلف ،سلف کے ساتھ تعلیم وتزکیہ سے جڑے رہتے تھے اور ان سے وہ سب کچھ حاصل کر لیتے تھے جسکو ان کے باپ دادا نے اپنے اسلاف سے حاصل کیا تھا۔اس طرح سے اہل بیت کی اولاد اور احفاد میں ان کے آباواجداد کے علوم ومعارف منتقل ہوتے رہے اور اسی کے ساتھ ساتھ خونی اور خاندانی اثرات اور خصوصیات منتقل ہوتے رہے اور اس اثر وفیضان اور ظاہری تعلیم وتربیت کا نتیجہ یہ نکلتا رہا کہ کبھی ان سادات سے تعلیم وتزکیہ کی خدمت ختم نہیں ہوئی اور ان کا علم وعمل جمود کا شکار نہیں ہوا اور ان کے اخلاق فاضلہ کی قبا چاک نہیں ہوئی اور پسر نمونہ پدر است کی مثال ہر دور میں سامنے آتی رہی، لیکن موجودہ دور میں یہ صورتحال ختم ہوتے دکھائی دے رہی ہے، اہل بیت کے افراد کا جو تاریخی کردار استفادہ اور افادہ سے متعلق رہا ہے، اس میں کمزوری کے آثار نمایاں ہوتے جارہے ہیں جس کا نمایاں اثر دیکھنے میں آرہا ہے کہ سادات کرام کے خاندانوں سے علم کی روشنی ختم ہوتی جارہی ہے اور اس کی خانقاہوں سے تعلیم وتزکیہ کا عمل ختم ہوتے دکھائی دے رہا ہے، طرفہ طرازی تو یہ ہے کہ یہ خانقاہیں بھی سنت کے احیا کا سبب بنی رہیں، اب ان میں بدعات وخرافات اور غیر شرعی رسومات، تصوف وروحانیت کے حوالہ سے زندہ ہیں۔

علم وعمل، تزکیہ وتطہیر، دعوت وتبلیغ میں ضعف وانحطاط درس وتدریس کا مشاہدہ علامہ اقبال نے بھی اپنی زندگی میں کیا تھا۔

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک — نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

حاصل کلام! اہل بیت کی علمی و دینی اور سیاسی و روحانی قیادت کا روشن ماضی لوٹ سکتا ہے اگر انکے افراد و اشخاص علم و فضل اور کمال کی مثالی وعبقری شخصیات بن کر ابھریں اور سراپا عمل و تقویٰ اور حسن اخلاق کا پیکر بن جائیں تو علامہ اقبال کا یہ خیال اور تصور حقیقت میں ڈھل جائے گا، لیا جائے گا کام تجھ سے دنیا کی امامت کا۔ **وماذلک علی اللہ بعزیز۔**

اب میں اس موضوع کی مزید وضاحت سے صرف نظر کرتے ہوئے آپ حضرات کرام کے سامنے بزرگان سادات کرام کی پاکیزہ اور عمدہ سیرتوں کی چند جھلکیاں پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں ہمارے لئے روشنی ہے۔

اہل بیت کے افراد و اشخاص میں عمدہ سیرت اور نیک اخلاق کے ایسے ایسے قابل تقلید نمونے ہیں جن سے ملت کے تمام طبقات مستفیض ہو سکتے ہیں اور ان سے ہر دور میں روشنی حاصل کی جا سکتی ہے مشتے نمونہ از خروارے، کے مصداق چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

اسلام میں حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کی ضرورت وحاجت پوری کرنا نہ صرف ایک انسانی اور اخلاقی عمل ہے بلکہ ایک عظیم نیکی اور آخرت میں بڑے اجر وثواب کا باعث ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا ذریعہ ہے، کوئی شخص خود ہی ضرورت مند ہو اور وہ اس حالت میں دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھے اور اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرے تو یہ وہ عمل ہے جسے ایثار وقربانی کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ایسا عمل مطلوب بھی ہے اور محبوب بھی، صحابہ کرام میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی جس کا ذکر قرآن کریم نے بھی کیا ہے: **ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ** ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود حاجت مند رہتے ہوئے بھی دوسروں کی حاجت پوری کرتے ہیں۔ اہل بیت کے افراد میں دوسروں کی حاجت پوری کرنے اور ایثار وقربانی سے کام لینے کی صفت ابتداء ہی سے رہی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ روزہ سے تھیں، افطار کے وقت ان کے پاس کھانے پینے کی جو چیزیں تھیں، وہ سب انہوں نے غریبوں میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ کوئی چیز بچی نہ رہی، اس موقعہ پر خادمہ آپہنچی اور کہنے لگی آپ بھی تو روزے سے ہیں اپنے لئے کچھ نہیں رکھا ہے یہ سن کر حضرت عائشہ نے کہا پگلی ذرا پہلے آکر کہہ دی ہوتی تو کوئی چیز روک لیتی تھی۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اہل بیت کی یہ مقدس و برگزیدہ جنتی خاتون حضرت عائشہ صدیقہؓ دوسروں کی حاجت وضرورت پوری کرنے میں اس قدر مصروف اور منہمک رہ گئیں کہ انہیں اپنی ضرورت کا خیال تک نہ رہا، اور وہ اس آیت طیبہ کی مصداق بن گئی،: **ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ (الحشر)**

سورہ دھر کی اس آیت کریمہ: **یطعمون الطعام علی حبہ الی اخرہ** ۔ کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بیمار ہو گئے تو بعض صحابہ نے حضرت علیؓ سے کہا، آپ دونوں بچوں کی صحت وشفا کے لئے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں، حضرت علیؓ کو یہ بات اچھی لگی، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ نے یہ نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ حسنؓ اور حسینؓ کو صحت عطا کرے تو ہم شکرانے کے طور پر تین دن روزہ رکھیں گے، اس کے بعد حضرات حسنینؓ صحت یاب ہو گئے، تو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ نے نذر کے روزے رکھنے شروع کئے، اتفاق کی بات ہے یہ ہے کہ ان دنوں حضرت علیؓ کے گھر فاقے پر فاقے گذر رہے تھے۔

پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کے لئے بیٹھے تو دروازہ پر ایک مسکین آیا اور اس نے کھانا مانگا، گھر والوں نے جو بھی دسترخوان پر تھا، سائل کو دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے، دوسرے دن افطار کے وقت ایک سائل یتیم آیا تو دسترخوان پر جو بھی تھا، اسے دے دیا گیا اور خود پانی پی کر سو رہے، تیسرے دن روزہ کھول کر کھانے کے لئے بیٹھے تھے کہ ایک قیدی آپہنچا اور اس نے کھانا مانگا تو گھر والوں نے دسترخوان پر موجود جو بھی رہا، قیدی کو دے دیا اور خود پانی پی کر سو گئے، چوتھے روز حضرت علیؓ اپنے بچوں کے لئے ہوئے نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرمؐ نے دیکھا کہ ان کے چہروں پر ضعف ونقاہت نمایاں ہے اس وقت آپ نے حضرت فاطمہؓ کے گھر کا رخ کیا تاکہ ان کی حالت جان لیں، جب آپ اندر داخل ہوئے تو دیکھا حضرت فاطمہؓ کا بھی وہی حال ہے اور وہ ایک کونے میں لیٹی ہوئی ہیں، نبی کریمؐ کے قلب مبارک پر گہرا اثر ہوا، آپ گھر سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لے آئے اور نبی کریمؐ سے عرض کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اہل بیت کے معاملہ میں آپ کو مبارک بادی ہے، آپؐ نے مبارک بادی کی وجہ پوچھی تو حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا:

حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی **یطعمون الطعام** یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت

کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس روایت کی صحت وعدم صحت اور روایت کے پہلو سے مفسرین کی جو بحث ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اتنی بات کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کا خود بھوکے رہ کر بھوکوں کو کھانا کھلانے کا عمل دوسرے مواقع میں ظہور پذیر ہوا ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

دل بدستہ آور دکہ حج اکبر است　　　از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

فقر ہو یا مرض، قرض ہو یا ناگہانی مصیبت، یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے آدمی کا دل مغموم اور رنجیدہ ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں اس کی شکستہ دلی اور اس کی تکلیف دور کی جائے تو یہ ایک ایسا عمل ہے۔ جو ہزار ہا عبادات وریاضات سے بہتر ہے، کسی کی دل جوئی کرنا حج اکبر سے بہتر ہے اور ہزار طواف کعبہ سے ایک دل بہتر ہے

ہمدردی وغم گساری اور مشکل کشائی وخیر خواہی میں حضرت حسینؓ کا یہ کردار ملاحظہ فرمائیں۔ نبی کریمؐ کے ایک صحابی حضرت اسامہ بن زید جنہوں نے بڑی لمبی عمر پائی، اپنی عمر کے آخری ایام میں سخت بیمار پڑ گئے، حضرت حسینؓ ان کی مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے، سلام ومصافحہ کے بعد ان کے قریب پہلو میں بیٹھ گئے، حضرت حسینؓ نے محسوس کیا کہ حضرت اسامہ کسی گہری فکر اور انتہائی رنج وغم میں مبتلا ہیں، کچھ دیر ادھر ادھر کی دلچسپ اور پُرمسرت باتیں کرنے کے بعد حضرت حسینؓ نے فرمایا، آپ کچھ متفکر اور مغموم دکھائی دیتے ہیں، آپ کو دنیا چھوڑنے کی فکر تو ہرگز لاحق نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ موت برحق ہے ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے۔

یہ سن کر حضرت اسامہ نے فرمایا، ہاں یہ بات درست ہے، میری پریشانی اور فکر کا سبب میرا قرض ہے جو ڈیڑھ ہزار درہم ہے اور مجھے یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ میں دنیا سے مقروض جا رہا ہوں، حضرت حسینؓ نے فرمایا آپ اسکی مطلق فکر نہ کیجئے میں ابھی آپ کا قرض ادا کئے دیتا ہوں، یہ کہہ کر اپنے گھر لوٹ آئے اور اپنے ساتھ رقم لے کر واپس چلے آئے اور حضرت اسامہؓ کا سارا قرض بے باق کر دیا اور ان کے علاج اور دیگر گھریلو اخراجات کے لئے بھی ایک خطیر رقم عنایت کی۔

حضرت علی بن حسین المعروف بہ امام زین العابدینؓ جن سے حضرت حسین کی آل اور اولاد کا سلسلہ دنیا میں جاری ہوا یہ بڑے سخی وفیاض اور غریب نواز تھے ان کی غرباء پروری کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی جو خدمت انجام دیتے تھے وہ کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے اور یہ ساری خدمت مخفی اور پوشیدہ طریقہ سے انجام دیتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون ان کی ضرورتوں اور حاجتوں کو کوئی شخص پورا کر رہا ہے، مورخین اور تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امام زین العابدین اپنی ظاہری حالت کو بدلتے ہوئے رات کے اندھیرے میں کھانے پینے کا سامان اپنی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے نکلتے اور محتاجوں اور غریبوں کے گھروں میں پہنچا کر خاموشی کے ساتھ نکل جاتے تھے اور کوئی آپ کو پہچان نہیں پاتا تھا، جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کی پشت پر وہ نشانات دیکھے گئے جو اناج کی بوریاں اٹھانے سے پڑ گئے تھے۔ اور یہ بات بھی آپ کی وفات کے بعد لوگوں کو معلوم ہوئی کہ مدینہ منورہ میں ایک سو مکانات ایسے تھے جن کی پرورش امام زین العابدینؓ کیا کرتے تھے اور ہزاروں افراد اس طرح گذر بسر کر رہے تھے کہ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے گھر کا خرچ کہاں سے آتا ہے جب امام صاحب انتقال کر گئے، ان کا سامان رسد بند ہو گیا تب انہیں اس بات کا علم ہوا (المرتضی)

امام زین العابدین جس طرح حقوق العباد کی ادائیگی میں سرگرم نظر آتے ہیں اسی طرح حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی کوشاں نظر آتے ہیں، فرائض وواجبات کی ادائیگی کے علاوہ سنن ونوافل، ذکر وتلاوت اور تسبیح وتہلیل میں رات کا بڑا حصہ گذار دیتے تھے اور بہت کم آرام فرماتے تھے۔

ایک رات مسجد میں مقیم تھے کہ اچانک مسجد کے ایک گوشہ میں آگ لگ گئی، لوگ دوڑے چلے آئے اور آگ بجھانے لگے، آپ کو آواز دی گئی کوئی جواب نہ ملا اور آپ باہر نہیں نکلے، لوگوں میں بڑی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی، آگ پر قابو پانے کے بعد کچھ لوگ مسجد کے اندرونی حصہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک گوشہ میں امام زین العابدین سجدہ کی حالت میں ہیں، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کو دیکھ کر پوچھا، اتنے سارے لوگ یہاں پر کیوں جمع ہوئے ہیں تو لوگوں نے بتلایا، مسجد کے ایک حصہ میں آگ لگ گئی تھی ہم نے آپ کو بہت پکارا لیکن جواب نہیں ملا، آگ بجھانے کے بعد ہم یہاں آپہنچے، امام صاحب نے فرمایا، مجھے تمہاری آوازیں سنائی نہیں دیں، تم سب دنیا کی آگ بجھانے میں لگے رہے، میں آخرت کی آگ بجھانے میں لگا رہا۔

امام زین العابدین کی یہ حالت اور کیفیت ان کے دادا محترم حضرت علیؓ کی اس حالت اور کیفیت سے ملتی جلتی ہے جب انہیں پیر میں تیر پیوست ہو گیا تھا اور شدید درد تکلیف میں مبتلا تھے اور کسی کو تیر نکالنے نہیں دے رہے تھے، تو بعض صحابہ نے فیصلہ کر لیا کہ حضرت علیؓ جب نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں گے تو ان کے پیر سے تیر نکال لی جائے، اس وقت انہیں پتہ نہیں چلے گا، جب حضرت علیؓ نے نماز شروع کی اور سجدہ کی حالت میں تھے صحابہ کرام نے تیر کھینچ کر نکال لیا اور حضرت علیؓ کو اسکا احساس نہیں ہوا۔ حالت نماز میں کامل یکسوئی اور توجہ الی اللہ کی جو مثال دادا (علیؓ) اور پوتے (زین العابدین) نے قائم کی ہے، یہ اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں میں نے امام زین العابدین سے زیادہ اللہ کا ڈر رکھنے والا کسی اور کو نہیں دیکھا۔

مولا حسینی واعظ کاشفی نے ''اخلاق محسن'' فارسی تصنیف میں لکھا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بیداری وعبادت گذاری اور دن بھر رعایا پروری کو دیکھ کر بعض صحابہ کرامؓ نے آپ سے فرمایا، اے علی سارا دن خلافت کے کاموں میں مصروف رہتے ہو اور ساری رات عبادت میں مشغول رہتے ہو، کچھ اپنے آرام کا خیال رکھئے؟ یہ سن کر آپ نے فرمایا علی دن میں آرام کرے گا تو رعایا ضائع ہو جائے گی اور رات میں آرام کرے گا توکل روز قیامت میں وہ ضائع ہو جائے گا

عبداللہؓ المحض جو امام حسنؓ کے پوتے ہیں علماء ان کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے، وہ باوقار عابد وزاہد بزرگ تھے، لوگوں کو ان پر بڑا اعتماد تھا اور ان کی بڑی وقعت تھی، بہت سے محدثین نے ان سے احادیث کی روایت کی ہے جن میں امام سفیان ثوری، اور، امام مالک بھی ہیں۔ (البدایہ والنھایہ)

امام حسنؓ اور امام حسینؓ دونوں حضرات کرام کی آل اور اولاد کی اکثریت تسلسل کے ساتھ تاریخ کے ہر دور میں خاندان نبوت کی امتیازی خصوصیات اور صفات وعادات کی حامل اور مظہر رہی ہے۔ اور ان دونوں حضرات سے خانوادوں اور خاندانوں کی جو شاخیں پھیلیں، ان سب کے اندر خاندانی اور خونی اثرات وکیفیات اور صفات پائی جاتی رہی ہیں۔

حضرات اہل بیت کی پاکیزہ سیرتوں کا ایک ممتاز پہلو نسبت نبویؐ کی غیرت وحمیت اور مبالغہ کے ساتھ تعریف کو ناپسند کرنا اور مبالغہ آمیز محبت کے اظہار سے نفرت کرنا بھی ہے اور یہ پہلو ان کے نیک مزاج اور اعلیٰ ظرف ہونے کی علامت ہے، اس عنوان پر مفکر اسلام علامہ سید شاہ ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے جو ان کی کتاب المرتضیٰ سے پیش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے ان حضرات کو نسبی تعلق کا جو شرف حاصل تھا، اس کے بارے میں ان کے اندر شدید غیرت واحتیاط پائی جاتی تھی، اس نسبت سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنا، اس کی ناقدری اور اس کا بے جا استعمال سمجھتے تھے، جس طرح دوسری قوموں اور مذاہب میں دیکھا جاتا ہے کہ اونچی ذات والے، اپنی عالی نسبی یا خاندان ونسل کی خصوصیت کو اس طرح کام میں لاتے ہیں کہ ان کے ماننے والے ان کو مقدس اور قانون سے بالا سمجھتے ہیں، گویا کوئی مافوق البشر مخلوق ہیں، لیکن تاریخ وسیرت کی کتابوں سے فرزندان رسول وسادات کرام کی خودداری اور عزت نفس کی جو تصویر ملتی ہے، وہ کلیۃ ان برہمن زادوں اور ایرانی ومسیحی دنیا کے مذہبی اجارہ داروں کے طرز عمل سے مختلف ہے، جو مذہب وخاندان کا استحصال کرتے ہیں، اور مذہبی خدمات کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، مختلف ادیان اور اقوام میں ایک طبقہ ہمیشہ ایسا رہا ہے جو پیدائشی طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا اور اس کو اپنی گزر بسر کے لئے کسی محنت یا جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اس کا سلسلہ دور حاضر تک جاری ہے۔

ایک مرتبہ سیدنا حسنؓ بازار تشریف لے گئے، کوئی چیز خریدنا چاہتے تھے، آپ نے اس کا بھاؤ معلوم کیا، دکان دار نے اس کی عام قیمت بتائی، ابھی سودا نہیں ہوا تھا کہ دکان دار کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ یہ نواسہ رسول حسن بن علیؓ ہیں، اس نے ذات نبویؐ سے تعلق اور نسبت کے احترام میں قیمت کم کر دی لیکن حضرت حسنؓ نے اس رعایت کو قبول نہیں فرمایا اور مطلوبہ چیز چھوڑ کر چلے آئے اور فرمایا میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قرب وتعلق کی بناء پر حقیر سے حقیر فائدہ بھی اٹھاؤں۔

یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے نسبی تعلق کے اظہار وافتخار کے بارے میں بہت محتاط تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہودیت، عیسائیت اور برہمیت کے جیسے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی طرح اس نسبی تعلق کو بیان کرنے میں مبالغہ آرائی اور غلو سے کام لیا جائے چنانچہ یحییٰ بن سعیدؓ سے روایت ہے وہ کہتے تھے کہ:

ایک مرتبہ کچھ لوگ حضرت زین العابدین کے پاس جمع تھے اور ان کی مدح سرائی کر رہے تھے آپ نے فرمایا، ہم سے محبت واحترام کا تعلق صرف اللہ کے لئے اور اسلامی رشتہ کی بناء پر قائم کیجئے، میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ہم سے ایسی محبت وعقیدت کا اظہار کرنے لگے ہیں جو ہمارے لئے

عار بن گئی۔ (حلیۃ الاولیاء بحوالہ المرتضیٰ)

حسنؓ (مثنیٰ) بن حسن بن علی ابو طالب رضوان اللہ علیہم نے ایک شخص سے کہا جو آپ کی مدح سرائی میں مبالغہ کر رہا تھا، اے نامرادو! ہم لوگوں سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرو، اگر ہم اس کے احکام پر چلیں تو ہم سے تعلق رکھو اور اگر ہم اس کی نافرمانی کریں تو ہم سے دور رہو، اگر اللہ تعالیٰ کسی کی قرابت اور رشتہ داری کی بناء پر رعایت کرتا تو بیٹے کی وجہ سے اس کے ماں باپ کو بخش دیتا، ہمارے بارے میں حق بات کہا کرو، کیونکہ تمہاری مطلب براری کے لئے یہ بہت کافی ہے اور ہم تم سے اس بات سے خوش رہیں گے (المرتضیٰ، ص ۳۸۴)

معزز حضرات!

ابھی ابھی آپ نے حضرات اہل بیت اور سادات کرام کی پاکیزہ سیرتوں سے متعلق کچھ باتیں سنیں، ممکن ہے کہ آپ میں سے کسی کے دل میں یہ خیال پرورش پا رہا ہو کہ یہ جو بھی باتیں کہی گئی ہیں وہ سب اہل بیت کی اولین شخصیات سے منسوب ہیں، موجودہ زمانے میں ایسی شخصیتیں کہاں ہیں؟ یہ خیال کسی حد تک جزوی حیثیت سے صحیح ہوسکتا ہے لیکن کلی اور عمومی طور صحیح نہیں ہوسکتا، اہل بیت کے سارے خاندانوں اور خانوادوں سے علم وفضل اور سیرت واخلاق کی اعلیٰ روایات ختم نہیں ہوئی ہیں اور آج بھی قدیم اور بے آمیز وغیر مخلوط اصل خانوادوں میں شریفانہ عادات اور کریمانہ اخلاق کے نمونے موجود ہیں، اور ان کے افراد واشخاص میں ہمدردی وخیر خواہی، مہمان نوازی وخدمت گذری، فیاضی وسیر چشمی، علم دوستی وعزت افزائی اور اعلیٰ ظرفی کے جذبات واحساسات اور اعمال وافعال کی مثالیں پائی جاتی ہیں اگر کسی خانوادے کے افراد میں اخلاقی کمزوری وپستی نظر آرہی ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک سفید دامن میں سیاہ داغ ہے۔

موجودہ زمانے میں اہل بیت کے بعض خانوادوں میں خاندان نبوت کے حقیقی وارثوں کی علامات ظاہر نہ ہونے کا سبب غالباً یہ ہوسکتا ہے کہ خود اہل بیت کے افراد میں اپنی اولاد کی دینی تعلیم وتربیت سے بے اعتنائی اور بے توجہی ہے، جب کہ ان کے آباء واجداد نے ان دو چیزوں تعلیم اور تربیت کو اہمیت دی، ماضی بعید میں حضرات اہل بیت اپنی اولاد کا نکاح کرنے سے پہلے نسب نامہ دیکھ لیا کرتے تھے تا کہ لڑکا لڑکی کے نجیب الطرفین ہونے کا علم ہو جائے، حالاں کہ یہ شریعت کا حکم نہیں ہے لیکن یہ حضرات اپنی نئی پود اور نئی نسل میں خاندانی اور خونی اثرات وخصوصیات اور عادات کی منتقلی کے پیش نظر ایسا کرتے رہے یہ کوئی بری بات نہ تھی، اور دوسری اپنی اولاد کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے اور کبھی اس پہلو سے غافل نہیں رہتے تھے، حضرت سید شاہ عبد اللطیف قادری، بیجاپور سے ہجرت کر کے ویلور تشریف لائے اور اپنی بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر مختلف شہروں میں ٹھہرتے ہوئے ویلور پہنچے تو تقریباً آٹھ دس سال کی مدت گذر چکی، لیکن اس مسافرت اور نقل مکانی کی حالت میں بھی اپنے صاحبزادے حضرت سید شاہ ابو الحسن قربی علیہ الرحمہ کو مختلف علوم وفنون کا درس دیتے رہے، اثنائے سفر چند ماہ کے لئے آرکاٹ میں مقیم رہے تو وہاں خود پڑھانے کے علاوہ مقامی علماء میں حضرت مولانا محمد حسین کے پاس پڑھنے کے لئے صاحبزادے کو بھیجتے رہے، اس طرح کی تعلیم وتربیت اور اخلاق نگہداشت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت قربی علم وفضل کے امام اور حسن اخلاق وسیرت کا حسین پیکر ثابت ہوئے، پھر انہوں نے اپنے والد ماجد کے طریقہ پر چلتے ہوئے اپنے فرزند حضرت سید شاہ عبد اللطیف ذوقی کی تعلیم وتربیت فرمائی جس کے نتیجہ میں وہ ارجمند وسعید اور صاحب فضل وکمال ثابت ہوئے، تاریخ کے کسی دور میں حضرات اہل بیت نے تحفظ نسب اور تعلیم اولاد کے مسئلہ میں کبھی بے اعتنائی اور عدم التفات کا مظاہرہ نہیں کیا، جس کی وجہ سے تاریخ کے ہر دور میں علماء ومشائخ سادات کے ہاتھوں میں زمام قیادت رہی، اسی جہت سے ان کی پیروی بھی ہوتی رہی، حضور اکرمؐ نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں وصیت کی کہ میں تمہارے درمیان کتاب اور میرے اہل بیت کو چھوڑ رہا ہوں، یہ میرے دونوں تمہارے لئے رہنما ہیں، ایک دوسری حدیث میں کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ بھی ہے، میں تمہارے درمیا کتاب اللہ اور میری سنت چھوڑے جا رہا ہوں، یہ دو چیزیں تھامے رہو گے تو تم کبھی گمراہ نہ ہوں گے، یہاں یہ پہلو قابل غور ہے کہ ایک حدیث میں سنت کا لفظ ہے اور دوسری حدیث میں اہل بیت کا لفظ ہے، سنت اور اہل بیت دونوں مختلف چیزیں نہیں ہیں یہ دونوں ایک دوسرے سے موافق اور مطابق ہیں اور اگر تاریخ کے کسی دور میں اہل بیت کا عمل مخالف کتاب وسنت نظر آجائے تو طاعت وپیروی سے کنارہ کش کا حکم بھی نبی کریمؐ نے دیا ہے لا طاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق، گناہ میں کسی کی پیروی نہ کرو خواہ کسے باشد۔

معزز حاضرین ومحترم سامعین!

اسلامی سال کے پہلے مہینے محرم الحرام کی مناسبت سے میں نے مسلسل جو خطبات دئے ہیں، ان میں اسلامی نئے سال، اہل بیت کی

فضیلت وشرعی حیثیت، اہل بیت کے اصل اور اولین افراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمہ ؓ کی زندگی، حضرات حسنین ؓ کی زندگی، مسئلہ خلافت اور شہادت حضرت حسین ؓ اور اہل بیت کے بزرگان کرام کی پاکیزہ سیرتوں اور ان کی تعلیمی اور اصلاحی خدمتوں وغیرہ کا سیر حاصل جائزہ لیا۔ ان موضوعات کی وضاحت کے بعد اس آخری خطبہ میں مجھے خیال آیا کہ محرم الحرام کے مہینے سے متعلق ایک دو اصلاحی باتوں کی وضاحت کردوں۔

مسلمانان اہل سنت وجماعت بھی محرم الحرام کے مہینے کو غم کا مہینہ سمجھ رہے ہیں اور اس میں شادی بیاہ، گھر کی تعمیر، گھر اور دکان کی افتتاح اور دیگر خوشی کی تقریبات انجام دینے کو ممنوع خیال کررہے ہیں۔ اور ایک مضحکہ خیز بات یہ دیکھنے میں آرہی ہے کہ نئے شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں جب پہلا محرم آجاتا ہے تو لڑکے کے گھر والے، دلہن کو اس کے ماں باپ کے ہاں بھیج دیتے ہیں تاکہ نوشاہ دسویں محرم شہادت کے دن تک اپنی دلہن سے ازدواجی تعلق قائم نہ کرسکے اور اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اس عجیب وغریب رسم کو ادا کرتے ہوئے کوئی یہ خیال نہیں کررہا ہے کہ ہم اپنے اس طریقہ سے حلال کو حرام قرار دینے کے مرتکب ہورہے ہیں۔

علماء نے کہا ہے کہ اس ماہ مبارک، شوال، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ میں کوئی نیک اعمال انجام دے گا تو اسے دیگر آٹھ مہینوں میں بھی نیک اعمال انجام دینے کی قوت اور ہدایت نصیب ہوگی۔

اس مقدس مہینے کو حضرت حسین ؓ کی شہادت سے غم وماتم کا مہینہ قرار دینا اور رنج وغم اور دکھ کے عجیب وغریب اور شریعت سے متصادم طریقے اختیار کرنا اور خوشی کے کاموں کو انجام نہ دینا حضرات صحابہ وتابعین اور سلف صالحین اور خود بزرگان اہل بیت کی سنت اور روش کے خلاف ہے۔

حضرت حسین کی شہادت کا واقعہ بظاہر تکلیف دہ ضرور ہے، لیکن شہادت تو شکر کا واقعہ اور طلب کا واقعہ ہے اور شہادت ایک بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کی عظمت اور منزلت کا اندازہ آپ حضرات نبی کریم ﷺ کے ان الفاظ سے لگاسکتے ہیں کہ آپ نے پروردگار سے یہ تمنا ظاہر کی ۔اے اللہ میں تیری راہ میں شہید ہوجاؤں، پھر تو مجھے زندگی دے تاکہ میں پھر شہید ہوجاؤں، اس طرح آپ ؐ نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا۔

لہذا آپ حضرات سے التماس ہے کہ اس ماہ مبارک میں خلاف شرع کاموں سے پرہیز کریں، اور حضرت حسین ؓ کی یاد اس طرح سے منائیں کہ آپ کی شان میں پروقار اور سنجیدہ مجلسیں آراستہ کیجئے، آپ اور دیگر شہدائے کربلا کی سیرت وسوانح سے لوگوں کو واقف کیجئے اور ان کی ارواح پر ایصال ثواب کیجئے، جس کی شرعاً گنجائش اور اجازت ہے کیوں کہ یہ اصل کے اعتبار سے جائز ہے اور تخصیص کے اعتبار سے بدعت حسنہ ہے اور یہ ایسی بدعت ہے جس کے ذریعہ عقیدہ اور عمل میں کوئی فساد نہیں ہے، ارواح کے لئے بدنی، مالی اور نفلی عبادات کا ثواب پہنچانا شرعاً محمود ہے، اس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، شہادت درحقیقت زندگی ہے، شہید اپنے رب کے پاس زندہ ہے، اور وہ رزق سے سرفراز ہے، اسے مردہ کہنے سے شریعت نے منع کیا ہے، جب وہ مردہ نہیں تو ماتم وسوگ ایک بے معنی چیز ہے، حضرت حسین ؓ کی شہادت تو ایک اعلیٰ ترین اور بے نظیر شہادت ہے، شاید رہتی دنیا تک کسی صاحب ایمان سے ایسی شہادت کی مثال قائم نہ ہوسکے گی، بھلا حسینی شہادت کیونکر ماتم اور آہ وزاری کی مستحق ہوسکتی ہے، یہ تو وہ خون ہے جس کے ایک ایک قطرہ سے اسلام کو تازگی اور زندگی نصیب ہوی، یہ واقعہ تو دراصل یزید کی موت ہے، محبان یزید کے لئے ماتم ہے اور حضرت حسین کی زندگی پہچان ہے اور ایک زندۂ جاوید شخصیت کے لیے، آفرین اور صد آفرین ہی کہا جاسکتا ہے۔۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں شریعت مطہرہ پر قائم رکھے اور بدعات اور خرافات سے بچنے کی ہدایت عطا فرمائے اور مبالغہ آمیز عقائد اور اعمال سے بچائے رکھے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

# نقوش طاہر

سالنامہ اللطیف میں حضرت اقدس مولانا ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمۃ سابق ناظمِ دار العلوم لطیفیہ ،حضرت مکان ویلور۔کا ایک مضمون ''**مہمان نوازی**'' قارئین کرام کی نذر ہے۔

ادارہ

اللہ جلِ شانہٗ اپنے کلامِ بلاغت نظام میں مہمان نوازی کی فضیلت ومنزلت بیان فرمایا ہے۔قرآنِ حکیم میں اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کے حالات وواقعات سنا کر آداب مہمان نوازی سے روشناس کرایا۔مہمان نوازی کے آداب وحدود،اصول وضوابط مقرر ہیں۔مہمان نوازی بے شمار محاسن فضائل و برکات کا باعث ہے۔مہمان نوازی کی وہ شان ہے کہ پیغمبروں کا پسندیدہ طرزِ عمل اور محبوب مشغلہ تھا۔اولیاءاللہ اور بزرگانِ دین مہمانوں کے ساتھ حسن سلوک اور خاطر مدارت کا برتاؤ کرتے رہے۔نیک سیرت بادشاہوں نے مہمانوں کی خاطر کے لئے مہمان خانے تعمیر کئے اوران کی عزت افزائی فرمائی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان اپنے ساتھ دو چیزیں لاتا ہے ایک تو قسمت دوسری برکت۔قسمت سے تو کھاتا ہےاور برکت چھوڑ جاتا ہے۔اگرکوئی مہمان تین دن سے زیادہ ٹھہرے تو مزید خاطر تواضع مہمان کا حق نہیں ہے، بلکہ اب جو کچھ میزبان سے حسن وسلوک کرتا ہے اسے صدقہ کا ثواب ملے گا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب کوئی مہمان آتا تھا تو آپ اس قدر مسرور ہوتے کہ دنبہ ذبح کر کے اپنے مہمان کی ضیافت تازہ گوشت سے کرتے اور اکثر آپ مہمان کی تلاش میں رہتے ،کھانا مہمان کے ساتھ تناول فرماتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حضور جب ہم فلاں قبیلہ کے لوگوں کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہماری باقاعدہ مہمان نوازی نہیں کرتے تو ہم ان کی مہمان نوازی کیوں کریں۔آپ نے جواب میں فرمایا،اگر وہ نہ کریں تو یہ ان کی اخلاقی کمزوری ہے،لیکن اس کی وجہ سے تم اپنی

اخلاقی کمزوری کا ثبوت کیوں دو۔تم پر اپنا اخلاقی فریضہ ہے کہ اپنے مہمان کی باقائدہ خاطر ومدارت کرو۔

مہمان پر بھی چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔وہ اپنے میزبان کی سلامتی، فلاح بہبودی چاہے، میزبان کے لئے دعائے خیر کریں، بے جا فرمائش نہ کریں۔میزبان پر اس کی مقدرت سے زیادہ بار نہ ڈالیں۔میزبان جو بھی اپنی حیثیت کے موافق انتظام کرے اسے بخوشی قبول کریں۔مہمان کو چاہئے کہ وہ اپنے میزبان کی حالت وسہولت کا خیال رکھے اسی طرح میزبان کو بھی چاہئے کہ اپنے مہمان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے اور فراغ دلی سے پیش آئے۔دل میں کچھ تنگی یا بار محسوس نہ کرے۔

حضرت مولانا ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرماتے تھے کہ مہمان کی آمد باعثِ مسرت ہونی چاہئے۔اللہ عزوجل رزاق ہے، بندہ جہاں جاتا ہے اپنا رزق ساتھ لے جاتا ہے، لہذا اس نے جو کچھ کھایا، یا پیا وہ اس کے مقسوم کا تھا۔آیت کریمہ ہے وما من دابة فی الارض الا علے اللہ یعنی ہر جاندار ذی روح کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔لہذا بندہ جب تک اس دنیائے فانی میں زندہ رہے گا اس کا رزق خدا کی طرف سے اس کو برابر ملتا رہے گا۔خواہ وہ اپنے وطن میں ہو یا غریب الوطن۔جب قانونِ قدرت یہ ہے تو بندہ محض ایک ذریعہ ہے۔ورنہ حقیقی رزق رساں حق سبحانہٗ تعالیٰ ہے، لہذا بندہ کو چاہئے کہ اس خدمت کی اذائیگی پر اپنے معبودِ حقیقی کا شکریہ ادا کرے۔

اس سلسلہ میں آپ نے ایک موثر دلچسپ واقعہ اپنی زبانِ شیریں بیان سے ذکر فرمایا کہ ایک بادشاہ کے پاس کثیر تعداد میں فوج تھی اور اس پر کافی خرچ آتا تھا۔ایک روز وزیر خاص نے بادشاہ سے فوج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، جہاں پناہ اس کثیر فوج پر بے شمار روپیہ خرچ ہوتا ہے جس کی وجہ سے خزانہ پر کافی خرچ پڑتا ہے۔اگر اجازت ہو تو آدھی فوج کم کردی جائے۔وزیر کے اس مشورہ پر بادشاہ نے کمی کا حکم دے دیا اور فوراً حکم کی تعمیل کردی گئی۔اس شب بادشاہ نے خواب دیکھا کہ اس کے خزانہ سے اشرفیوں کی تھیلیاں چلی جارہی ہیں اور خزانہ خالی ہوا جارہا ہے۔اتفاقاً ایک بزرگ اسی حالتِ خواب میں رونما ہوئے۔بادشاہ ممدوح کے استفسار پر بزرگ نے فرمایا کہ اتنی کثیر مخلوق اور بندگانِ الٰہی کا رزق تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو پہنچاتا تھا۔جب تم نے بڑی تعداد میں فوج کو برطرف کردیا تو ان کا رزق بھی اُن کے ساتھ جاتا رہا۔اس واقعہ کے راز واسباب سے آگاہ ہوکر بادشاہ نہایت درجہ متاثر ہوا اور صبح سویرے برخواست شدہ فوج کی بحالی کا حکم نافذ کردیا اور فوج کے سب سپاہی اپنے کام پر مامور ہوگئے۔اسی شب بادشاہ نے پھر خواب دیکھا کہ جو اشرفیوں کی تھیلیاں خزانہ سے چلی جارہی تھی وہ پھر دوبارہ خزانہ میں جمع ہورہی ہیں، بادشاہ کو سرور وسکون حاصل ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ذیل میں ایک واقعہ ناظرین اللطیف کی بصیرت اور عمل کے لئے سپردِ قلم کرتا ہوں جس سے قدرت الٰہی کی فیاضیوں کی کرشمہ سازیاں نظر آئے گی۔

ایک روز ایک بزرگ کہیں جارہے تھے دفعتاً کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھنگھور گھٹا اٹھی اور ایک مخصوص سمت میں رواں دواں ہوگئی، محترم بزرگ کو اس کی حقیقت جاننے کی امنگ پیدا ہوئی فوراً اپنے گھوڑے کو اسی سمت پھیرا اور ابر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ایک جگہ پہنچ کر بادل خوب برسنے لگا جب وہ زمین کا مخصوص حصہ پانی سے سیراب ہوگیا تو بادل چھٹ گیا۔اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر بزرگ موصوف نے مالک زمین سے ملاقات کی اور اس حقیقت کا راز معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔انہوں نے جواب میں کہا کہ اس زمین میں جو اناج پیدا ہوتا ہے اس کے تین حصے کئے جاتے ہیں، ایک حصہ تخم پاشی کے لئے رکھ دیا جاتا ہے۔اور دوسرا حصہ مساکین وغرباء میں تقسیم کیا جاتا ہے اور تیسرا حصہ اپنے اہل وعیال اور خویش واقارب کے لئے رکھا جاتا ہے ۔یہ اسی حسن عمل کا نتیجہ اور خیر وبرکت ہے، جو آپ نے مشاہدہ کیا۔ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ خود بندے کے ساز وسامان کی درستگی کا ضامن وکفیل ہوجاتا ہے اور اسے ضائع اور برباد ہونے سے بچالیتا ہے۔

مہمان نوازی کی اہمیت وفضیلت کا صحیح اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے فرمائیے۔اب سے کوئی ایک صدی پہلے حضرت قطب ویلور رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مدینہ منورہ میں ہوا۔اس وقت آپ کے صاحبزادۂ بلند اقبال حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی مدینہ منورہ میں تھے۔ایسے وقت ایک قندھاری حضرت مکان آئے اور مسجد میں ٹھہر گئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شہر کی آبادی زیادہ نہ تھی اسلئے شام ہوتے ہی شہر ویران ویران معلوم ہوتا تھا، نہ بجلی کی روشنی تھی اور نہ ہی چہل پہل تھی، سرشام ہی لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں میں چلے جاتے تھے۔قندھاری صاحب کی آمد کا کسی کو مطلق علم نہ ہوا۔اسی وقت خواب میں پیر روشن ضمیر صاحب ولایت وکرامت حضرت قطب ویلور رحمۃ اللہ علیہ جن کا وصال مدینہ میں ہوچکا تھا اور یہاں اس وقت کوئی نہ تھے اپنی خادمہ سے کہا کہ اپنے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں اور کسی کو خبر نہیں، خادمہ نے پوچھا کہ حضرت وہ کون صاحب ہیں، آپ نے فرمایا فلاں سید صاحب قندھاری ہیں جو مسجد میں مقیم ہیں، خادمہ نے جواب میں کہا کہ سالن نہیں ہے، آپ نے جذبہ سے فرمایا چٹنی ہی کافی ہے۔فوراً ہی خادمہ نیند سے بیدار ہوئی اور کھانے اور سالن کا انتظام کیا، اس درمیان رات کافی گزر گئی تھی اسلئے صبح کی اذان کی منتظر تھی، جونہی مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا بلند کیا، مہمان کے سامنے پیش کیا گیا۔

مہمان موصوف کو بڑی حیرت ہوئی کہ بے شان وگمان جب کہ میری آمد کا کسی کو علم نہیں تھا یکایک صبح

سویرے کھانا تیار ہوکر کیسے آ گیا، آپ نے متعجب خادمہ سے اس کا سبب دریافت کیا اور اس وقت تک کھانے سے انکار کیا جب تک حقیقتِ حال معلوم نہ ہو۔ خادمہ کو مجبوراً پچھلی شب کے خواب کا معاملہ بیان کرنا پڑا، معزز مہمان نے کہا کہ تم نے خواب کے بعد معاملہ کی تحقیق کیوں نہ کرلی، اس نے جواب دیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، خواب صحیح تھا اور آپ کا قیام خواب کی صحت کی دلیل ہے۔ قندھاری صاحب اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور بعدازاں تناول طعام فرمایا۔ بزرگانِ دین بہ قیدِ حیات ہوں یا رحلت فرما چکے ہوں مہمان کی قدر و منزلت اور مہمان نوازی کے لئے وہ ہر حال میں تاکید و ہدایت فرماتے رہتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کی مہمان نوازی کا بھی ایک واقعہ مشہور ہے جس کو مختصراً پیش کرتا ہوں۔ آپ کے زمانۂ سیر و سیاحت میں کسی دوست نے آپ کو اپنے گھر قیام کی دعوت دی، شیخ سعدی نے بخوشی منظور کرلیا اور کچھ عرصہ تک وہاں قیام کا ارادہ کرلیا، کھانے کے وقت دسترخوان بہت ہی پرتکلف اور انواع واقسام کے کھانے، میوہ جات اور مشروبات سے چنا ہوا ہوتا تھا۔ شیخ جب یہ منظر دیکھتے تو متلفانہ کہتے کہ ''ہائے دعوتِ شیراز'' ہر وقت کھانے میں اس دوست کا یہی معمول رہتا اور شاہانہ ضیافت میں کوئی کسر باقی نہ رکھتا۔ جب شیخ نے میزبان حد سے زیادہ تکلفات کو ملاحظہ فرمایا تو وہاں مزید قیام کا ارادہ ترک کردیا اور میزبان سے رخصت ہوکر بہت جلد واپس آ گئے ۔ واپسی کے وقت شیخ صاحب نے دوست کو اپنے وطن شیراز آنے کی دعوت دی جس کو انہوں نے بھی بصد شوق قبول کرلیا، چند دن بعد وہ شیراز آئے اور شیخ سعدی کے مہمان رہے۔ دورانِ قیام میں دسترخوان پر وہی سیدھا سادا کھانا جو عموماً لوگ روزمرہ کھاتے ہیں، پیش کردیا جاتا اور دونوں ساتھ کھالیتے، ایک روز دوست نے ازراہ تعجب کہا کہ آپ دعوت شیراز کو بہت یاد کرتے تھے کیا یہی دعوت شیراز ہے؟ شیخ سعدی نے فرمایا دعوتِ شیراز یہی ہے اور یہ اس سے بہتر ہے، اسطرح اگر تم میرے پاس سالہا سال قیام کرو بلکہ زندگی بھی گزار دو تو مجھے کوئی بار یا گرانی محسوس نہ ہوگی۔ لیکن آپ کی پرتکلف دعوت صورت میں اگر میں چند دن اور قیام کرتا تو باعث زحمت و کلفت اور بارِ خاطر ہو جاتا۔ اسی وجہ سے میں آپ کے یہاں زیادہ قیام نہ کرسکا۔ لیکن اس میں نہ میزبان کو تکلیف اور نہ مہمان کو۔ آپ جتنے بھی دن چاہے قیام کرسکتے ہیں، ورنہ تکلفات میں ضرور تکلیف ہوتی ہے اور مہمان کی آمد باعث تنگی اور پریشانی ہوگی۔

اللہ عزوجل اسلام کے اصول و آداب و حدود پر چلنے کی ہدایت دے اور مہمان نوازی کی توفیق عطا کرے۔ آمین ثم آمین

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

# مولانا سید شاہ عثمان قادری جوار رحمت میں

## ”شیوۂ ماحکایت مہر ووفااست“

مولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی لطیفی ایم ۔اے ، پی ، ایچ ڈی
استاذ تفسیر دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

شخصیات کی تعارفی اور تاریخی حیثیت عجیب وغریب ہوتی ہے ،بعض شخصیتوں سے خاندان پہچانے جاتے ہیں تو بعض شخصیتیں خاندان سے پہچانی جاتی ہیں ، مولانا عثمان صاحب کی شخصیت ویلور میں ۱۱۳۲ھ سے موجود خاندان حضرت قطب ویلور سے نسبت مصاہرت کے باعث علمی وعرفانی دنیا میں متعارف ہوئی ، مولانا عثمان تلنگانہ کے دارحکمت حیدرآباد میں اکتوبر ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے ، آپ کے والد ماجد جناب سید احمد حسینی صاحب ، اے پی آفیس سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ٹرپ بازار کی مسجد میں امامت اور خطابت سے منسلک رہے ، مولانا عثمان نے جونیر کالج کاچی گڈھا حیدرآباد سے بی کام پاس کیا ، انگریزی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد رشتہ ازدواج کی اساس پر ویلور دار السرور آ پہنچے خاندان حضرت قطب ویلور کے بانی حضرت سید شاہ عبداللطیف بیجاپوری ثم ویلوری (متوفی ۱۱۵۰ھ) کی نرینہ اولاد کی آخری صلبی کڑی حضرت ابوالحسن سید شاہ محمد طاہر قادری متوفی ۱۹۸۶ء کی ذات گرامی ہے جن کی دو صاحبزادیوں سے آل کا سلسلہ جاری وساری ہوا ، آپ کے تینوں برادران حقیقی حضرت مولانا ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری (متوفی ۱۳۷۸ھ ) اور حضرت مولانا ابوصالح عمادالدین سید شاہ محمد ناصر قادری متوفی ) اور اعلیٰ حضرت مولانا ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری (متوفی ۱۴۱۵ھ ) کی کوئی اولاد نہیں ، مؤخر الذکر بزرگ آخری صلبی سجادہ نشین ثابت ہوئے ، جن کی وفات سے حضرت سید عبداللطیف قادری بیجاپوری کی نرینہ اولا کی سجادگی کا سلسلہ ختم ہوا

حضرت ابوالحسن سید شاہ محمد طاہر قادری کی بڑی صاحب زادی مولانا عثمان صاحب کے عقد میں آئیں اور چھوٹی صاحبزادی مولانا سید شاہ ھلال احمد شطاری بڑامکان بنگلور کے نکاح میں آئیں ۔ مولانا عثمان کے دولڑکے سید شاہ طاہر قادری اور سید شاہ باقر قادری اور دولڑکیاں ہیں اور مولانا ھلال شطاری سے صرف دولڑکیاں ہیں

حضرت پیر صاحب کی نرینہ اولاد نہ رہنے کے باعث مولانا عثمان اور مولانا ھلال مستقل طور پر حضرت مکان ہی میں رہائش پذیر رہے حضرت پیر صاحب نے مولانا عثمان کی دینی تعلیم کے لئے مولانا مولوی محمد حسین باقوی سابق پرنسپل اسلامیہ کالج کرنول آندھرا پردیش استاذ دار العلوم لطیفیہ کو منتخب فرمایا جنہوں نے مولانا عثمان کے اندر عربی اور فارسی کی قابلیت اور صلاحیت پیدا کر دی ، اسی استعداد کا اثر تھا کہ مولانا عثمان نے مدراس یونیورسٹی سے افضل العلماء کا امتحان پاس کیا اور اسی یونیورسٹی سے اردو

میں ایم اے، کیا اورڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، اور پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان ''حضرات اقطاب ویلور اوران کے خلفاء کے دینی اور علمی کارنامے'' پروفیسر مرحوم عابد صفی کی نگرانی میں مکمل کیا۔

حضرت پیر صاحب نے مولانا ھلال شطاری کی دینی تعلیم کے لئے مولوی عبدالحکیم نوری رضوی استاذ دارالعلوم لطیفیہ کو مقرر کیا، مولانا عثمان دارالعلوم لطیفیہ کے ناظم اور مولانا ھلال نائب ناظم کی حیثیت سے اپنی اپنی خدمات انجام دیں، اور دونوں نے اعلیٰ حضرت صاحب سجادہ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور خلافت سے مشرف ہوئے ۱۴۱۵ھ میں اعلیٰ حضرت کی وفات ہوئی تو مولانا عثمان سجادہ نشین ہوئے، اور انہوں نے اپنی زندگی دینی اور دعوتی طرز پر ڈھال لی، خطبۂ نکاح، خطبۂ جمعہ، فرض نمازوں کی امامت، دینی مجلسوں میں تقاریر، غم وخوشی کی مجالس میں دعاوغیرہ کوحسن وخوبی اور سلیقہ کے ساتھ انجام دینے لگے آپ کے ہاتھ پر کئی لوگوں نے بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے، مولانا عثمان اپنی علالت کے دوران اپنے بڑے فرزندارجمند جناب سید شاہ محمد طاہر قادری کو سجادہ نشین مقرر کیا۔

مولانا عثمان کی تعلیمی خدمات کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے سال نامہ اللطیف کی اشاعت میں پوری پوری دل چسپی لی، اور راقم الحروف سے فرمایا کرتے تھے، حضرت پیر صاحب اللطیف آپ کے سپرد فرما کر دنیا سے رخصت ہوگئے، اب اللطیف آپ کی زندگی سے جڑا رہیگا۔ اللطیف بشیر الحق اور بشیر الحق اللطیف ہے لہذا آپ اپنی ادارت کے فرائض حسب عادت سابقہ مکمل آزادی کے ساتھ یکسوئی ودلچسپی اور حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہئے۔

اللطیف کے علاوہ مولانا عثمان کا ایک عظیم کارنامہ یہ رہا ہے کہ حضرت قطب ویلور کی تین مفید اور اہم ترین فارسی تصنیفات (۱) فصل الخطاب (۲) مکتوبات حضرت قطب ویلور (۳) غایۃ التحقیق کا مکمل ترجمہ جو راقم الحروف کے قلم سے صدور پذیر ہوا تھا اور وہ اللطیف کے متعدد شماروں میں قسط وار مکمل چھپ چکا تھا، انہوں نے ۲۰۱۱ء میں فصل الخطاب اور ۲۰۱۲ء میں مکتوبات حضرت قطب ویلور اور ۲۰۱۳ء غایۃ التحقیق کے ترجمہ کو دارالعلوم لطیفیہ کے تصنیفی ادارہ دارالتصنیف والاشاعت سے شائع کیا اور اہل علم کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقعہ فراہم کیا، اس کے علاوہ خانوادہ اقطاب ویلور کے ۹ سجادگان کرام کی سیرت وسوانح پر اولین کتاب جو مولانا محمد ذکریا ادیب خاور راچوٹی سابق استاذ دارالعلوم لطیفیہ نے لکھی تھی اور وہ دارالعلوم لطیفیہ کی جانب سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوچکی تھی، مولانا عثمان نے ۲۰۱۴ء میں اس کی دوبارہ اشاعت کی، اور اپنے خسر محترم حضرت پیر صاحب کے سارے مضامین جو اللطیف میں شائع ہوچکے تھے، ان کا مجموعہ نقوش طاہر کے نام سے ــــ ء میں شائع کیا اور مولانا عثمان نے ۱۹۹۶ء میں راقم الحروف کے مختصر تعارف پر محیط ایک رسالہ جناب علیم صبانویدی کے مقدمہ اور ڈاکٹر راہی فدائی کے تاثرات کے ساتھ شائع کیا، ڈاکٹر راہی فدائی کا تاثر ذیل میں پیش کیا جارہا ہے جس سے مولانا عثمان کی شخصیت اور علمی صفت نمایاں ہورہی ہے

''ڈاکٹر مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ قادری ایم، اے (پی ایچ ڈی) ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور کی ذات والاصفات جامع کمالات ہے، آپ نہ صرف انگریزی زبان کے فاضل ہیں بلکہ علوم شرعیہ کے عالم بھی ہیں، آپ نے حضرات اقطاب ویلور قدس سرہم اوران کے خلفاء کے علمی خدمات پر ایک شان دار تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس کی افادیت واہمیت مسلم ہے، آپ کے نوک قلم سے یوں تو ،بیسوں مضامین نکل کر سرمۂ اہل بصیرت بن چکے ہیں، مگر زیر نظر مقالہ کی خصوصیت وامتیاز سب سے جداگانہ اس لے ہے کہ آپ نے ایسی شخصیت کو اپنا موضوع تحریر بنایا ہے، جوابنائے دارالعلوم لطیفیہ میں اپنی گراں قدر علمی خدمات اور بیش بہا تصنیفات وتالیفات کی وجہ سے پانے معاصرین میں ممتاز ومنفرد مقام اور مرتبہ کی حامل ہے

مولانا مولوی حافظ بشیر الحق قریشی لطیفی قادری ایم، اے، علمی وادبی دنیا کے لئے محتاج تعارف نہیں ہیں، مولانا نے حضرات اقطاب ویلور کے عظیم ترین کارناموں کو بڑی عمدگی اور سلیقہ مندی سے پیش کر کے اہل علم وفضل سے داد تحسین حاصل کی ہے، تاہم آپ کے فن اور شخصیت کے بھرپور تعارف اور تفصیلی جائزہ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی''۔

الغرض مولانا عثمان کی ذات گرامی سے بانی خاندان حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری ثم ویلوری کی آل سے خانقاہ حضرت قطب ویلور کی سجادگی اور دارالعلوم لطیفیہ کی نظامت کا دور شروع ہوا، آپ کی وفات ۱۴ آگسٹ ۲۰۱۹ء بعد نماز مغرب ہوئی دوسرے دن بعد نماز عشاء نماز جنازہ ادا کی گئی، استاذ محترم مولانا سید شاہ محمد انوار اللہ سر قاضی قادری لطیفی استاذ دارالعلوم لطیفیہ نے نماز پڑھائی اور حضرت مکان کے اندورنی احاطہ میں واقع خاص قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، بعد تدفین اس عاجز راقم الحروف کی تلقین اور دعائے مغفرت سے مولانا عثمان کی زندگی زیر زمین کا اخروی دور شروع ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ مختصر تعارفی تحریر شریعت مطہرہ کی اس ھدایت وتاکید پر اختتام پذیر ہے، اذکروا محاسن موتاکم وکفواعن مساویھم

مسلمانو! تم میں سے جو بھی کلمہ گو دنیائے فانی سے رخصت ہوجائے تو تم صرف اس کے محاسن بیان کرو اور اس کی لغزشوں کو زبان پر نہ لے آؤ۔ از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

''ڈاکٹر مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ قادری ایم،اے (پی ایچ ڈی) ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور کی ذات والاصفات جامع کمالات ہے، آپ نہ صرف انگریزی زبان کے فاضل ہیں بلکہ علوم شرعیہ کے عالم بھی ہیں ،آپ نے حضرات اقطاب ویلور قدس سرہم اوران کے خلفاء کے علمی خدمات پرایک شان دار تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس کی افادیت واہمیت مسلم ہے، آپ کے نوک قلم سے یوں تو ،بیسوں مضامین نکل کر سرمۂ اہل بصیرت بن چکے ہیں، مگر زیر نظر مقالہ کی خصوصیت وامتیاز سب سے جداگانہ اس لیے ہے کہ آپ نے ایسی شخصیت کو اپنا موضوع تحریر بنایا ہے، جوابنائے دارالعلوم لطیفیہ میں اپنی گراں قدر علمی خدمات اور بیش بہا تصنیفات وتالیفات کی وجہ سے پانے معاصرین میں ممتاز ومنفرد مقام اور مرتبہ کی حامل ہے

مولانا مولوی حافظ بشیرالحق قریشی لطیفی قادری ایم،اے، علمی وادبی دنیا کے لئے محتاج تعارف نہیں ہیں، مولانا نے حضرات اقطاب ویلور کے عظیم ترین کارناموں کو بڑی عمدگی اور سلیقہ مندی سے پیش کرکے اہل علم وفضل سے داد تحسین حاصل کی ہے ،تاہم آپ کے فن اور شخصیت کے بھرپور تعارف اور تفصیلی جائزہ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی''۔

الغرض مولانا عثمان کی ذات گرامی سے بانی خاندان حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری ثم ویلوری کی آل سے خانقاہ حضرت قطب ویلور کی سجادگی اور دارالعلوم لطیفیہ کی نظامت کا دور شروع ہوا،آپ کی وفات ۱۴ آگسٹ ۲۰۱۹ء بعد نماز مغرب ہوئی دوسرے دن بعد نماز عشاء نماز جنازہ ادا کی گئی ،استاذ محترم مولانا سید شاہ محمد انوراللہ سرقاضی قادری لطیفی استاذ دارالعلوم لطیفیہ نے نماز پڑھائی اور حضرت مکان کے اندرونی احاطہ میں واقع خاص قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، بعد تدفین اس عاجز راقم الحروف کی تلقین اوردعائے مغفرت سے مولانا عثمان کی زندگی زیرزمین کا اخروی دورشروع ہوا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

یہ مختصر تعارفی تحریر شریعت مطہرہ کی اس ھدایت وتاکید پر اختتام پذیر ہے،**اذکروا محاسن موتاکم وکفواعن مساویھم**

مسلمانو! تم میں سے جوبھی کلمہ گو دنیائے فانی سے رخصت ہوجائے توتم صرف اس کے محاسن بیان کرواور اس کی لغزشوں کو زبان پر نہ لے آؤ۔ از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

**وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔**

# خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمی- حیات وخدمات

ڈاکٹر سید سجاد حسین

سابق پروفیسر وصدر شعبہ اردو، مدراس یونی ورسٹی

دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز مفکر، فقیہ الاسلام، متکلم عصر، دین وملت کے مربی اعظم، عارف باللہ، شیخ الحدیث اور خطیب الاسلام حضرت محمد سالم قاسمیؒ کا شمار بیسویں صدی کے ان قدآور علمائے دین میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی دینی علوم کی نشرواشاعت، تبلیغ دین اورامت کی اصلاح وتربیت کے لئے وقف کردی تھی۔ نسبتوں کا یہ عالم کہ حضرت الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم کے نبیرہ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے فرزند عالی مقام، امین وعلم بردار اور صحیح جانشین تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۸؍جنوری ۱۹۲۶ء کو بمقام دیوبند ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے انفرادی طور پر حاصل کی۔ ثانوی تعلیم اور سند فراغت دارالعلوم دیوبند سے ملی۔ حضرت خطیب الاسلام مولانا محمد سالم اس علمی خانوادے کے امانت دار اور نسلی وارث تھے جس نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانان ہند کی سیاسی پسپائی اور شکست خوردگی کے بعد انھیں ازسرنو کمربستہ ہونے آگے بڑھنے اور اپنی شناخت قائم کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ آپ کا سراپا نسبی نجابت، اخلاقی شرافت اور علمی وجاہت کا آئینہ دار تھا۔ ہمیشہ خنداں وفرحاں نظر آتے۔ لبوں پر جمال انگیز مسکراہٹ چھائی رہتی، ان کی پررونق مخصوص پگڑی ہر ملنے والے کو دعوت نظارہ دیتی۔ اس وصف میں موصوف اپنے والد بزرگوار حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ حضرت خطیب الاسلام کے اس اقتباس سے ان کے انداز نظر اور ذہنیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے؛

> ''رسول اور صحابہ نے دین کی دعوت دی، تابعین کے زمانہ میں مسلک کی تبلیغ ہونے لگی اور آج کل لوگ اپنے اپنے ذوق کی اشاعت کررہے ہیں۔ لوگو آؤ مسلک، مشرب اور ذوق کی بجائے دین کی دعوت کو اپنا محور بنالو۔''

آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکرؓ تک پہنچتا ہے اسی لئے آپ کا خانوادہ صدیقی کہلایا۔ اس خانوادے کی ہندوستان آمد سے متعلق 'الامام الاکبر' کے مصنف ڈاکٹر محمد اویس صدیقی نانوتوی فرماتے ہیں؛

> ''سب سے پہلے اس خاندان کے جس فرد نے ہندوستان کا رخ کیا وہ قاضی مظہر الدین ہیں جو نویں صدی ہجری کے اواخر میں سکندر لودھی کے زمانے میں اس کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے۔ اسی زمانے میں نانوتا اور اس کے اطراف واکناف میں جاٹوں نے سر اٹھایا جن کی سرکوبی کے لئے سکندر لودھی نے قاضی مظہر الدین کے فرزند قاضی میراں کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا۔ لشکر کی کامیابی پر خوش ہوکر سکندر لودھی نے یہ علاقہ نانوتا اس خاندان کے نام کردیا اس کے بعد سے اس خاندان نے نانوتا میں بودوباش اختیار کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد سے مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے اہل خانہ دیوبند کے ہوکر رہ گئے۔''

حضرت خطیب الاسلام کے والد ماجد حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں۔ آپ علم وکمال، حکمت و

بصیرت، فہم وفراست، اخلاق وعمل، پاکیزگی وتقدس کی ایک خوبصورت تصویر، مسلک حق کے ترجمان اور ملت کے صالحین کی سیرت وکردار کے عکس جمیل تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت بھی دیوبند میں ہوئی۔ سات سال کی عمر میں تعلیم کی ابتدا کی۔ حصول تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کیا اور مختلف علوم وفنون کی اہم کتابیں پڑھائیں۔ ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۷ء تک آپ دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم کے منصب پر فائز رہے پھر آپ کو مہتمم منتخب کیا گیا۔ اس عہدہ پر آپ تاحیات فائز رہے۔ یوں تو مولانا قاری محمد طیبؒ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ اس وقت مولانا محمد رابع حسینی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں؛

”حکیم الاسلام کی شخصیت اپنے عہد کی بڑی مایہ ناز علمی وادبی شخصیت تھی۔ علم دین اور حکمت ودانش کے بلند پایہ حامل تھے۔ انھوں نے اپنے عظیم مورث اور علوم دینیہ میں مقام بلند رکھنے والے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے جو علمی گیرائی اور وسعت کی وراثت پائی تھی اس کو ان کی تقریروں، تحریروں اور دوران دروس میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ انھوں نے اس بلند علمی مقام کے ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم درسگاہ کو جوان کے اسلاف کی کوششوں کا مرکز رہی تھی اپنے آغاز جوانی میں سنبھالا اور اس کی خدمت میں اپنی پوری عمر لگادی۔ ان کی کوششوں کا مظہر صرف دارالعلوم دیوبند کی ترقی وترویج ہی میں نمایاں اور محدود نہیں تھا بلکہ اس کے نمائندہ خاص ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا۔ مسلمانوں میں جو دینی انحراف یا عقائدی خرابی پائی جاتی تھی اس کے ازالہ میں بھی خصوصی حصہ لیا۔ وہ ایک دلنواز اسلوب کے حامل خطیب تھے ان کی شخصیت بھی دلنواز تھی وہ اپنی باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ دلنواز طرز وانداز کے بھی مالک تھے۔ طبیعت میں حد درجہ انکساری نرم مزاجی اور خوش اخلاقی تھی۔ ان سے مل کر نہ صرف مسرت حاصل ہوتی تھی بلکہ طبیعت خود بخود ان کی طرف مائل ہوجاتی تھی۔ گفتگو اور انداز کلام صرف دل کو نہیں ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے والا ہوتا تھا۔ اپنی بات کو علمی وتاریخی حوالوں اور مثالوں سے واضح کرتے تھے۔ بعض اہم ترین موقعوں پر علماء کی طرف سے ان کی نمائندگی بڑی موثر ثابت ہوتی۔ اس طریقہ سے دراصل دیوبند جو علوم دینیہ کا ایک موثر ترین ادارہ تھا اور ہے اس کی صحیح نمائندگی کا مولانا نے حق ادا کیا اور آخری دم تک اس کے مہتمم کے منصب پر فائز رہے اور جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی اس کو بخوبی نبھاتے ہوئے ۱۹۸۳ء کو اس جہان فانی سے کوچ کرگئے۔“

حضرت خطیب الاسلام اپنے والد ماجد حضرت حکیم الاسلام کی نگرانی وتربیت میں پرورش پائی۔ سات سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز کیا۔ ناظرہ وحفظ قرآن کریم کی تکمیل کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی زبان مبارک سے میزان پڑھی۔ یہ عظیم سعادت اس وقت پوری دنیا میں آپ کو ہی حاصل ہوئی تھی آپ کے علاوہ حکیم الامت سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے والوں میں اب کوئی اور موجود نہیں ہے۔ ۱۹۴۸ء میں حفظ قرآن کریم سے فراغت کے بعد آپ نے دورۂ حدیث شریف کی تعلیم اپنے عہد کے مشہور ومعروف اساتذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب حضرت مولانا ابراہیم بلیاوی اور حضرت مولانا فخرالحسن سے حاصل کی۔ حضرت خطیب الاسلام کی ذاتی صلاحیت، علمی تبحر اور خطابی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ تعلیمی مراحل سے فراغت کے فوراً بعد ہی آپ دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس مقرر ہوئے اور ابتداً سیرۃ الصحابہ اور ترجمہ قرآن کریم کا درس آپ سے متعلق رہا پھر بعد میں بخاری شریف، ابوداؤد شریف، مشکوۃ شریف،

ہدایہ، شرح عقائد وغیرہ کتابیں آپ سے متعلق رہیں لیکن آخری عمر میں آپ نے بخاری شریف کی درس وتدریس کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ آپ جملہ علوم وفنون میں ممتاز صلاحیتوں کے مالک، بالغ نظر اور بلند فکر کے حامل تھے۔ علوم قاسمی کی تشریح وتفہیم میں حکیم الاسلام کے بعد شاید ہی آپ کا کوئی ہم پلہ ہو۔ ہمیشہ علمی کاموں میں منہمک رہتے۔ زمانہ تدریس میں دارالعلوم دیوبند میں ایک تحقیقی شعبہ مرکز المعارف کا قیام عمل میں آیا اور موصوف اس کے ذمہ دار بنائے گئے۔ ۱۹۹۶ء میں مراسلاتی طریقہ تعلیم کی بنیاد پر اسلامی علوم ومعارف کو جدید جامعات میں مصروف تعلیم طلباء وطالبات کے لئے آسان وقابل حصول بنانے کی غرض سے شعبہ دینیات دیوبند قائم فرمایا جو اس دور کا خوبصورت ترین طریقہ تعلیم تھا۔ علاوہ ازیں آپ نے قرآن کریم پر ایک خاص حیثیت سے کام کا آغاز بھی کیا لیکن یہ عظیم فاضلانہ علمی کام شورش دارالعلوم کی نذر ہوکر رہ گیا۔ اس سے قطع نظر آپ کے عالمانہ وحکیمانہ خطبات کا شہرہ عہد شباب ہی میں ملک اور بیرون ملک میں ہونے لگا تھا۔ علم میں گہرائی، فکر میں گیرائی، مطالعہ میں وسعت، مزاج میں شرافت واستقلالی، زبان پر قدرت، گفتگو فکر وبصیرت سے منور اور کتاب وسنت کی تشریح وتفہیم پر بے پناہ دسترس یہ وہ امتیازی کمالات ہیں جن سے آپ کی ذات مرصع ومزین تھی۔ ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں پیدا ہوئے اختلافات کے بعد آپ نے اپنے رفقاء کے تعاون سے دارالعلوم وقف کے نام سے دوسرا دارالعلوم قائم کرلیا جس کے شروع سے آپ مہتمم اور سرپرست رہے۔ یہاں بھی آپ نے درس وتدریس کو جاری رکھا اور بخاری شریف کی تدریسی خدمات کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ حضرت خطیب الاسلام کی دینی، علمی اور تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ جن اسلامی اداروں سے وابستہ رہ کر دین اسلام کی نشرواشاعت اور شریعت کی حفاظت اور پاسداری کی وہ حسب ذیل ہیں؛

۱۔ مسلم پرسنل لابورڈ کے نائب صدر

۲۔ سرپرست دارالعلوم وقف دیوبند

۳۔ صدر مجلس مشاورت

۴۔ رکن مجلس انتظامیہ وشوری ندوۃ العلماء

۵۔ رکن مجلس شوری مظاہر العلوم وقف

۶۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی شرعی عدالت کے رکن

۷۔ سرپرست کل ہند رابطہ مساجد اور

۸۔ سرپرست کل ہند اسلامک فقہ اکیڈمی

آپ کی بے پناہ صلاحیتوں اور قابل قدر خدمات کے اعتراف میں حکومت مصر نے ممتاز عالم کے نشان امتیاز سے سرفراز کیا۔ اسی طرح مولانا قاسم نانوتوی ایوارڈ، حضرت شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے علاوہ اور بہت سے انعامات واعزازات سے بھی آپ کو نوازا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالی نے مولانا کو گوناگوں خصوصیات اور بے شمار امتیازی صفات سے نوازا لیکن مولانا کی ایک اہم خصوصیت جس کا ہر ایک کو اعتراف ہے وہ امت اور ملت کی فکر میں اپنا سب کچھ قربان کردینا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنی عمر کے ۹۰ سال میں بھی ملک وبیرون ملک کے اسفار اختیار کرتے، جلسوں میں شریک ہوتے، عوام سے مخاطب ہوتے، اداروں اور مدارس کی سرپرستی ونگرانی فرماتے تھے۔ ہر وقت آپ کو امت مسلمہ کی فکر دامن گیر رہتی اور اس کی خیر وصلاح اور فلاح وبہبود کے سلسلے میں کوشاں رہتے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ تمام کاموں کو موصوف بحسن خوبی انجام دیتے تھے۔ یوں تو مولانا نے مختلف طریقے پر دین کی خدمت انجام دی ہے لیکن مولانا کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ دینیات کے نصاب کا قیام اور اس کی ترویج واشاعت ہے۔ مولانا نے جب محسوس کیا کہ بچوں اور بچیوں کے لئے تعلیمی

ادارے تو بہت ہیں اور الحمد للہ آئے دن اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن بڑی عمر کے لوگوں کے لئے دینی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ۱۹۹۶ء میں مولانا نے جامع دینیات کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس کے ذریعہ گھر بیٹھے دینی تعلیم حاصل کرنے کا آسان طریقہ متعارف کرایا جو آپ کی حیات تک آپ کی سرپرستی میں جاری و ساری تھا۔

آپ کے پسماندگان میں چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں میں محمد سلمان قاسمی، محمد سفیان قاسمی، محمد ادنان قاسمی اور حافظ محمد عاصم قاسمی ہیں جو آپ کے علمی وراثت کے امین ہیں جب کہ لڑکیوں میں اسما اعجاز اور عظمی ناہید بھی اپنے والد کی طرح دینی و علمی سطح پر حلقہ خواتین میں دینی بیداری لانے کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

حضرت خطیب الاسلام کا اہم اور نمایاں وصف خطابت ہے اور خطیب الاسلام، خطیب العصر، مجدد عصر اور جانشین حکیم الاسلام جیسے خطابات سے یاد کئے جاتے ہیں۔ چونکہ خطابت میں منفرد و یکتا تھے اس لئے آپ کے معتقدین کا ایک بڑا حلقہ ملک و بیرون ملک میں موجود تھا۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے دیوبند میں قیام و تدریس و اہتمام کے ایام کے مقابلے میں اسفار و اجلاس، کانفرنس، سیمینار وغیرہ میں شرکت کے لئے دورے زیادہ کئے۔ آپ کے علمی، دینی، تعلیمی، تبلیغی، تاریخی اور ادبی موضوعات سے متعلق کئی جلدوں پر مشتمل خطبات کا مجموعہ 'خطبات خطیب الاسلام' کے نام سے ادارہ دارالاشاعت، حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے جو امت اسلامیہ کے لئے رہتی دنیا تک باعث ہدایت ہی نہیں بلکہ توشہ فلاح کا باعث ہوگا۔ کثرت اسفار اور بے پناہ مشغولیات کے باوجود مولانا مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کے لئے بھی وقت نکالتے اور مختلف عنوانات پر بیش قیمت مقالے تحریر فرماتے اور بے شمار کتابوں کے لئے تاثراتی کلمات، پیش لفظ، مقدمے اور تقریظات قلم بند کیا کرتے تھے۔ آپ کی چند کتابیں دینی علوم سے متعلق زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور بہت سارا مواد منتظر طباعت ہے۔ آپ کی مطبوعہ کتب میں 'مبادی التربیۃ الاسلامیہ'، 'تاجدار ارض حرم کا پیغام'، 'مرد غازی' اور 'ایک عظیم تاریخی خدمت' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت خطیب الاسلام سے متعلق یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنی گوناگوں مشغولیات کے سبب باضابطہ طور پر تصنیف، تالیف اور تحقیق کا میدان اختیار نہیں کیا البتہ آپ کے تبحر علمی سے مستفیض ہو کر ارباب علم و فضل نے مختلف موضوعات پر کئی ایک اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت خطیب الاسلام کی ذات نے مکتبہ فکر دیوبند کو تمام اکابر علمائے دیوبند کی فکر و بصیرت اور علمی وراثت سے نہ صرف جوڑے رکھنے کا کام انجام دیا بلکہ حجۃ الاسلام کے دینی، علمی اور تعلیمی کارناموں کو انگریزی اور عربی زبان میں ترجمہ کر کے پوری دنیا میں عام کر دیا۔ غرض حضرت خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمیؒ نے اپنے خانوادۂ گرامی قدر کی عالمگیر پیمانے پر خدمات کے سلسلے کو باقی رکھتے ہوئے جس طرح اس کو وسعتیں بخشیں، ترقیات سے ہمکنار کیا اور وسیع و عریض طریقہ پر رواں دواں رکھا وہ تاریخ عالم اسلام میں ایک عہد آفریں کارنامہ سے کم نہیں۔ بقول شخصے؛

وہ جس نے علم کی مشعل سے ہر سو روشنی کردی
وہ جس نے سینہ ظلمت کے اندر بھی ضیا بھردی
کیا جس نے چراغ دانش و فہم و ذکا روشن
جسے کہنا پڑا سارے جہاں کو علم کا مخزن

☆☆☆☆

# اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار

پروفیسر قاضی حبیب احمد
صدر، شعبہ عربی، فارسی و اردو
مدراس یونی ورسٹی

اردو کی تعلیم و تدریس کے مختلف وسیلوں میں سے ایک اہم وسیلہ مدرسہ بھی ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں مدارس اور مکاتب کا گویا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ جتنی تعداد میں مدارس اور مکاتب ہیں شاید اتنی مقدار میں عصری تعلیم کے اردو ادارے بھی موجود نہیں ہیں۔ مدارس اور مکاتب کی نوعیتیں اور طریق کار جداگانہ ہے۔

**مدارس کا منظر نامہ:**

مدارس دراصل ہمارے قدیم طرز تعلیم کا حصہ ہیں۔ قدیم زمانے میں مندروں تیرتھ استھانوں، گروکل اور پاٹ شالاؤں میں تعلیم کا بھی نظم موجود ہوتا تھا۔ یہاں تاریخ، قواعد، منطق، اخلاقیات، طب، ہندسہ، شگون، زائچہ شناسی، جوتش، بھوت ودیا، حربیات، سمیات، عطر کشیدگی، رقص وموسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہ تعلیم سب کے لئے عام نہیں تھی۔ یہ شاہی خاندان اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لئے مخصوص تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ تحدیدات ختم ہوگئیں۔ تعلیم کے نظریہ میں بھی وسعت پیدا ہوگئی۔ درس وتدریس کا جو نظام انھوں نے بغداد، خراسان، مصر اور اسکندریہ میں قائم کیا ہوا تھا۔ اسے ہندوستان میں بھی پھیلایا۔ اس وقت تک اداروں کی صورت نہیں بنی تھی۔ بلکہ تعلیم کا مرجع رجال تک محدود تھا۔ ہر فن کے ماہرین موجود تھے۔ ہر ایک اپنے جوہر کی الگ الگ شہرت رکھتا تھا۔ طالبان ان کی تلاش میں نکلتے اور خدمت میں حاضر رہ کر مستفیض ہوتے تھے۔ چراغ سے چراغ جلتا تھا۔ یہ تعلیم صرف دینی اور اسلامی علوم تک محدود نہیں ہوتی تھی۔ اس میں تاریخ، فلسفہ، ریاضی، منطق، جغرافیہ، فلکیات، نجوم، طب سبھی کچھ شامل تھا۔ تعلیم کے لئے اداروں یا مدارس کا رواج بہت بعد میں ہوا۔ حالانکہ ہندوستانی روایات کے مطابق ہرش وردھن کے زمانے میں نالندہ، اسلامی حکومت میں مصر کی مشہور درسگاہ جامعہ ازہر جو آج بھی قائم ہے مشہور ومعروف ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور میں پانچ اقسام کی دینی درسگاہیں تھیں، جو مختلف پیرائے میں دینی تعلیمات کی نشرواشاعت کرتی رہیں۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں۔

> ''اسلامی ہند کے ابتدائی دور میں مندرجہ ذیل کی درس گاہیں ملتی ہیں۔ (۱) حکومت کی قائم کی ہوئی (۲) خانقاہوں سے ملحق (۳) مسجدوں سے ملحق (۴) مزاروں سے ملحق (۵) انفرادی
>
> حکومت کی قائم کی ہوئی درس گاہوں میں مغربی مدرسہ، ناصری مدرسہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ناصریہ مدرسہ، ناصر الدین محمود کی یاد میں سلطان التمش نے بنوایا تھا۔ منہاج السراج، رضیہ کے عہد میں اس مدرسہ کے پرنسپل تھے۔
>
> بختیار خلجی نے جب بہار فتح کیا تو وہاں بہت سے مدرسے قائم ہوئے۔ ایک اور التمش کا زمانہ ہندوستان میں چشتیہ اور سہروردیہ سلسلے کی خانقاہیں قائم ہوئیں، سہروردیہ سلسلے کی خانقاہوں کے ساتھ مدارس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اس سلسلے کے مشہور بزرگ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی کو تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ اور انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم

وتربیت کے لئے قابل اساتذہ متعین کئے تھے اوران کو معقول تنخواہیں دیتے تھے۔ چشتیہ سلسلے کی خانقاہوں میں اعلیٰ مریدوں کی تعلیم کا انتظام رہتا تھا۔ بابا فرید نے حضرت محبوب الٰہی کو قرآن پاک کے چند پارے، تمہید ابو شکور سالمی، عوارف المعارف کا درس دیا تھا۔ دیگر مشائخ کا سلسلہ بھی تعلیم کا کچھ نہ کچھ اہتمام کرتے تھے۔(۱)

ہندوستان میں مدارس اور مکاتب کی اہمیت کا احساس سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریک سے پیدا ہوا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کے بزرگوں نے ایک طرف مغربی افکار ونظریات کی آندھیوں سے مذہبی بنیادوں کو تحفظ دینے کے لئے اور انگریز حملہ آوروں کے خلاف ملک گیری اور آزادی کے جذبے کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو صف آراء کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں کے خلاف ملک بھر میں زبردست محاذ آرائی ہوگئی۔ انگریز حکمران علماء کو اپنا سب سے بڑا دشمن اور مدارس کو حریف ٹھکانوں کے طور پر تاکنا شروع کردیا۔ لیکن ہندوستان بھر میں معجزاتی طور پر نمو پذیر مدارس کے اس جال کو وہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ علوم مشرق اور اسلامی قدروں کی پاسداری میں ہندوستان کے علمائے دین کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی

''بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی آزادی کا صور پھونکا گیا، آزادی کی تحریک اور تحریک خلافت وجود میں آئی تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ قربانیاں طبقہ علماء کے افراد اور فضلائے مدارس نے دیں'' (۲)

بہر حال ان مدارس اور مکاتب نے بھلے ان کا نصاب کچھ ہو، عموماً اردو کو ذریعہ تعلیم کے لئے چنا۔ یہ انیسویں صدی کا زمانہ تھا۔ درباروں کو زوال آگیا تھا۔ مطلق العنان بادشاہوں اور خودسرامیروں کی اجارہ داری ختم ہورہی تھی۔ تعلیم کی روشنی نے عوام کو جمہوریت سے قریب اور اپنے حقوق کی حصول یابی کے لئے چاق وچوبند کردیا تھا۔ عوام کے ساتھ عوام کی زبان یعنی اردو نے بھی اپنا حق حاصل کرلیا تھا۔ وہ اب ادبی زبان بن کرا بھر رہی تھی۔ تدریس کے دیگر شعبوں کی طرح مدارس نے بھی اسی زبان کو گلے لگایا۔ اس سچویشن کا بڑا معقول تجزیہ پروفیسر اختر الواسع نے پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے

''اردو اور اس کے حوالے سے اپنی تہذیبی تاریخ کے اس پہلو سے تو ہم سب واقف ہیں کہ یہ ۱۹ویں صدی تھی، جس کے دوران اردو کو ایک علمی زبان کی حیثیت سے رواج اور استحکام حاصل ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے تک اردو ادبی اظہار کی مختلف صورتوں پر حاوی ہوکر ایک خود مختار تہذیبی مظہر بن چکی تھی مگر علمی اظہار کے معاملے میں ابھی تک عموماً عربی اور فارسی کو بالادستی حاصل تھی۔ لیکن مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے تحت جب اردو کو علمی اظہار کا بار اٹھانے کی زحمت دینے کی کوششیں شروع ہوئیں تو اس کے ساتھ وہ زمانہ بھی آن لگا جب اردو معاشرہ ایک نئی سیاسی اور تہذیبی آویزش کی گرفت میں آ گیا۔ اس عالم میں مغرب کے سیاسی تسلط اور غلبے کا موجب بننے والے علوم کی زبان انگریزی ایک حریف کی شکل میں سامنے آئی۔''(۳)

انگریزی کی مخالفت محض ایک زبان کی مخالفت نہیں تھی بلکہ ایک پوری تہذیب اور غاصبانہ ذہنیت کی مخالفت تھی۔ اس مخالفت کا علم اس دور میں مدارس کے علماء نے تھام رکھا تھا۔ علمائے دین کی انگریزی مخالفت کے پس پردہ ان کا جذبہ حب الوطنی کارفرما تھا۔ بقول مولانا شوکت علی بستوی

''اگر ملک میں قدیم تعلیمی ادارے، برادران وطن کی پاٹھ شالائیں اور دینی مدارس نہ ہوتے تو ''میکالے'' کی وہ حکمت عملی سو فی صد کامیاب ہوجاتی، جس کے تحت ہندوستانیوں کو جسم کے اعتبار سے ہندوستانی اور دل ودماغ

کے اعتبار سے انگریز بنانے کی مہم چلائی گئی تھی۔''(۴)

اس دور میں اردو کی ترقی و ترویج کے لئے عربی مکاتب و مدارس اور علمائے دین کی جو بے پایاں خدمات رہی ہیں، ان کا احاطہ مشکل ہے۔ اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ کے فرزندان نے قرآن کریم کے اردو میں پہلی مرتبہ تراجم کئے تو یہ اعلان تھا کہ دینی علوم کی اشاعت کے لئے اب اس زبان کو منتخب کرلیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ عربی اور فارسی سے زیادہ اردو میں دینی کتب کی اشاعت ہورہی ہے۔ بقول اختر الواسع

''اب اردو ایک علمی زبان کے در پر پوری شدت سے دستک دے رہی ہے اور ایسے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں جو اس زبان کو اپنے ذہن و خیال کی ضابطہ بندی کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے اردو ان مدارس کا بنیادی علمی اظہار بنتی چلی گئی۔''(۵)

اردو زبان کا یہ کردار ایک خالص علمی ضرورت کے لئے ہے۔ لیکن یہ زبان ابتداء سے ہی صوفیاء کرام کے ہاں رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ بنی ہوئی تھی۔ باوجود فارسی کی بالادستی کے یہ عوام کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ افادہ عام کی غرض سے صوفیاء و علماء نے اسی زبان کا انتخاب کیا۔ اردو نثر کے اولین نقوش کی تلاش آج بھی انھیں علماء و صوفیاء کرام کے فرموداتی خزینوں میں تلاش کئے جاتے ہیں۔

**مدارس کی اہمیت:**

مدارس کی بنیادی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ مذہب اسلام کا تشخص برقرار رکھنے اور اس عمارت کی بنیادوں کو اپنی اصل کے مطابق بحال رکھنے کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ یہ براہ راست اردو کی اشاعت میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن اردو زبان جز ولاینفک کی طرح ان سے جڑی ہوئی ہے۔ جو خدمات ان سے غیر شعوری طور پر اردو کے سلسلے میں انجام پا رہی ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہئے۔ ان کے کردار اور طریق کار سے نہ بحث ہوسکتی ہے نہ تعارض۔ خود علامہ اقبال نے بھی ان کی افادیت اور امتیاز کا احساس کیا تھا۔ اقبال، حکیم احمد شجاع سے اپنی ایک گفتگو میں کہتے ہیں۔

''ان مدرسوں، مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدرسوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا درویش نہ رہے، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں سے اگر محروم ہوگئے، تو بالکل اسی طرح، جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برسوں کی حکومت کے باوجود آج ''غرناطہ'' اور ''قرطبہ'' میں کے کھنڈرات اور ''الحمراء'' اور ''باب الاخوتین'' کے نشانات کے سوا کوئی نقش نہیں ملتا، اسی طرح ہندوستان میں بھی آگرے کے ''تاج محل'' اور دلی کے ''لال قلعے'' کے سوا مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا'' (۶)

مدارس کے نصب العین میں کبھی کسی زبان کی ترقی پیش نظر نہیں رہی۔ مدارس میں عربی، فارسی اور اردو کا درجہ محض ان کے نصاب تعلیم کی ترسیل کے لئے ایک وسیلے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ البتہ ان وسیلوں کی بنیادیں یہاں بہت مضبوط بنائی جاتی ہیں۔ ترسیل کے ان وسیلوں کی یہاں تحصیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ ایک محقق کی نظر سے وہ عوامل بھی اوجھل نہیں رہ سکتے جو اس مشن کے ساتھ اردو زبان وادب کی اٹھان کے لئے سبب بن رہے ہیں۔ چونکہ زبان کا ظرف و تناظر نہایت وسیع ہوتا ہے، لہٰذا ایک زبان کے طالب علم کے لئے زبان کی ترقی میں مدرسہ کی وساطت اور وسیلے کی اہمیت پر روشنی ڈالنا ازحد ضروری ہوجاتا ہے۔

**مدارس کا طرز تدریس:**

مستثنیات سے ہٹ کر عام مشاہدہ یہ ہے کہ افکار وخیالات اور مواد وموضوع کی ندرت ووسعت سے قطع نظر زبان کی پختگی اور عالمانہ گرفت کے سلسلے میں مدارس کے طلباء جتنے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں، اس قدر ہماری عصری جامعات وکلیات کے طلباء کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ مدارس کے تعلیمی نظام کی کامیابی کا راز سب سے پہلے تو اس کا جامع اور باوقار نظام تعلیم ہے، جسے سب سے پہلے ملا نظام الدین سہالوی (المتوفی ۱۱۶۱ھ) نے ترتیب دیا لیکن وقتاً فوقتاً ترمیم واضافے سے زیدہ مستحکم اور مفید ہوکر اب دنیا بھر کے عربی مدارس میں رائج ہے۔ اس نصاب یا اس کے متوازی کسی اور نصاب کا مدارس میں نفاذ ایک اور اہم عامل ہے۔ جس تنظیم وترتیب، اہتمام اور پابندی، انہماک و مستعدی، جاں فشانی وجاں کاوی سے طلباء واساتذہ اس کی تکمیل میں جٹ جاتے ہیں۔ اس کا نمونہ عصری تعلیم کے ڈھانچے میں شاذ ہی نظر آئے گا۔ کچھ ڈھیلے ڈھالے مدرسوں کے ماسوا اکثر معروف ومستند مدارس کا یہی طریقہ مشاہدے میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ مدارس کے فارغ طلباء کی اردو استعداد، املا وتلفظ، تحریر وتقریر، زبان ومحاورے پر گرفت، زیادہ بہتر اور مستند ہوتی ہے۔

**مدارس کے اقسام:**

مدارس کو سہولت کے لئے تین خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی اور بنیادی مدارس مکاتب کہلاتے ہیں۔ مکاتب مساجد کا حصہ ہوتے ہیں، مساجد ہی کے احاطہ میں قائم ہوتے ہیں اور مساجد ہی کی انتظامیہ کے زیر اہتمام کام کرتے ہیں۔ جہاں ناظرہ قرآن شریف، بنیادی اسلامی عقائد کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اکثر مکاتب میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا بھی نظم موجود ہے۔ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ دوسری قسم متوسط درجے کے مدارس کی ہے۔ جہاں ناظرہ قرآن شریف کے علاوہ حفظ قرآن اور درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے جو عموماً عربی وفارسی میں ہوتا ہے۔ بعض مدرسوں میں اس روایتی نصاب سے ہٹ کر عربی آمیز نصاب رکھا گیا ہے جس میں منطق اور فلسفہ نکال کر منقولات ہی پر اکتفا کی گئی ہے اور زبان وانشاء کی تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ ان مدارس میں اردو زبان بھی شامل نصاب ہوتی ہے اور پورے نصاب کا ذریعہ تعلیم عموماً اردو ہی ہوتا ہے۔ متوسط درجے کے مدارس کی بہت بڑی تعداد برصغیر ہند وپاک میں موجود ہے۔ ان مدارس سے لاکھوں کی تعداد میں طلباء فیض یاب ہورہے ہیں اور اس کا مطلب ہے کہ اتنی ہی تعداد اردو زبان سے بھی بہرہ ور ہوتی ہے۔ اور تیسری قسم کے مدارس وہ بڑے مدارس ہیں جو عالمی شہرت کے حامل ہیں اور مختلف مسالک اور مکتب ہائے فکر کے ترجمان اور علم بردار ہیں۔ جیسے دار العلوم، دیو بند، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مظاہر العلوم، سہارنپور، جامعہ سلفیہ، بنارس، مدرسہ شاہی، مراد آباد، جامعہ سلطان المدارس، لکھنو، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد، جامعہ دارلسلام، عمرآباد، باقیات الصالحات، ویلور، دار العلوم سبیل الرشاد، بنگلور وغیرہ۔ ان جامعات میں طلباء کی تعداد کہیں کہیں دس ہزار تک پہنچتی ہے۔ یونیورسٹیوں کی طرز پر یہاں مختلف عقلی ونقلی علوم کے الگ الگ شعبے قائم ہیں۔ ان مضامین میں تخصیص اور اعلیٰ تعلیم کا بھی نظام موجود ہے، جیسا کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان جامعات کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اس کے علاوہ ادب وانشاء، قواعد اور املا، اردو کتابت وخطاطی، مضمون نویسی اور انشاء پردازی کی خصوصی مشق، بحث ومباحثے اور مناظروں کی خصوصی تربیت، خطابت اور تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے مشقوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعض جامعات میں تحریری قابلیت بڑھانے کے لیے قلمی رسالوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان بڑے بڑے مدرسوں کے ترجمان ماہوار رسالے اور سالنامے تو ہوتے ہی ہیں۔ جن کی زبان کا معیار اونچا ہوتا ہے۔ غرض اردو زبان کی تدریس کا نہایت موثر اور عمدہ نظام ہم کو مدارس میں ملتا ہے۔ البتہ معیار کے لحاظ سے درجہ بندی ہوسکتی ہے۔ اردو ادب کا بھلے ہی یہاں التزام نہ ہو لیکن زبان دانی اس سے بہتر شاید ہی کسی اور وسیلے سے ممکن ہو۔ اس کے علاوہ نشر واشاعت اور تصنیف وتالیف کا شعبہ مسلسل کام کرتا رہتا ہے۔ تعلیم کا یہ منظم انداز اردو زبان کی ترویج واشاعت کا ایک بہترین وسیلہ ہے جو غیر محسوس طریقے سے بغیر کسی دعوے کے خاموش خدمت انجام دے رہا ہے۔ مدارس کی تعلیم وتدریس کے لئے برصغیر ہندو

پاک میں صرف اردو زبان کوذریعہ تعلیم رکھا گیا ہے۔کسی اور زبان کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔

**اردو تلفظ اور املا:**

اردو زبان کا تلفظ بہت حد تک عربی قواعد کا رہین منت ہے۔اردو کے بیشتر الفاظ کا تلفظ عربی ترکیب پر قائم ہے لہٰذا جب تک عربی زبان سے شد بد حاصل نہ ہو کما حقہ، اردو الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنا مشکل ہے۔لغت کی مدد سے کچھ حد تک تلفظ معلوم کیا جا سکتا ہے۔لیکن اصول اور قواعد کی جان کاری عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔اس لیے اردو کے کلیاتی و جامعاتی نصابوں میں بھی عربی اور فارسی کے اسباق شامل رہتے ہیں۔ان دونوں زبانوں کے پس منظر کے بغیر اردو زبان وادب کی تدریس مکمل نہیں ہوسکتی۔مدارس جو عربی وفارسی کا منبع و مصدر ہوتے ہیں اپنے طلباء کو اردو کا صحیح تلفظ درست املا اور خوش خط لکھنے کی بھی مشق کراتے ہیں۔اس سے اردو کی تحریر و قرأت میں بڑی سہولت اور آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

**مدارس کی صحافت:**

مدارس میں انشا پردازی اور مضمون نویسی کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ہندوستان کے اکثر بڑے مدارس میں اس کا خاص اہتمام پایا جاتا ہے۔طلباء کی تحریری تربیت کے لئے قلمی رسالوں کا اہتمام اور اس سلسلے میں اہل قلم اساتذہ کی نگرانی و سرپرستی، مسودوں کی اصلاح ومشورے اور حوصلہ افزائی سے مدارس زبان وادب کی ایک درس گاہ وتربیت گاہ کی بھی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔بقول اختر الواسع

> ''زور بیان وقلم کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے مدارس کی تعلیم میں باضابطہ اہتمام ہوتا ہے۔اس کے لئے مشقی پروگرام ہوتے ہیں۔ادبی مقابلے کئے جاتے ہیں۔ادب وشعر کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں اور وسیع مطالعہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔جس کے نتیجے میں اساتذہ اور طلباء مدارس اظہار وبیان کی صلاحیتوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔مدارس سے شائع ہونے والے اردو رسائل و جرائد بھی یہی خدمت انجام دیتے ہیں۔'' (۷)

مدارس کے وسیلے سے قوم وملت کو باصلاحیت اور مشاق قلم کاروں کی فراہمی کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے۔ہر بڑے مدرسے سے ایک یا ایک سے زاید سالنامے، ماہنامے اور پندرہ روزے شائع ہو رہے ہیں۔اور اپنے مخصوص دائرہ کار میں نہایت عمدہ کام کر رہے ہیں۔ان کی زبان اور اسلوب، فصاحت وبلاغت، فکری بالیدگی اور تجزیاتی خوش سلیقگی قابل ستائش ہے۔یہ موضوع اتنا بسیط ہے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

**اردو ادب کی تعمیر اور علمائے کرام:**

اردو ادب کی تعمیر اور اسے سمت ورفتار عطا کرنے میں جن اشخاص نے حصہ لیا ان میں بیشتر مدرسے کے پرداختہ علمائے کرام رہے ہیں۔سرسید احمد خاں عصری علوم کی ترویج کے لئے ہندوستان میں سب سے پہلے محاذ آراء ہوئے۔لیکن وہ خود مدارس کے نظام کے پروردہ تھے۔اسی طرح ان کے تمام رفقاء کا بھی حال تھا۔ان حضرات گرامی نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اردو شعر ونثر کی دنیا میں انقلاب بپا کیا۔دراصل مدارس کے تناظر سے اٹھنے والی یہی جماعت اردو ادب کے نشاۃ ثانیہ کی ذمہ دار بھی ہے۔اس سلسلے میں سرسید کے رفقاء اور متعلقین میں علامہ شبلی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی عبدالحق، مولانا وحید الدین سلیم وغیرہ حضرات کا مدرسہ سے علاقہ رہا ہے۔بقول پروفیسر اختر الواسع

> ''یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں اردو کے علمی فروغ کی جو سرگرمی دینی مدارس میں جاری تھی، اسے ہی ایک

طرح سے اردو کے ذریعے برپا ہونے والی تہذیبی نشاۃ الثانیہ کی جائے پیدائش کہا جاسکتا ہے۔خود سرسید اور ان کے رفقاء انہی دینی مدارس اور ان کے طرز تدریس کے پروردہ تھے۔اس لئے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اردو کی علمی تشکیل اور استعمال کی بنیادی جائے عمل دراصل مدارس ہی ہیں۔"(۸)

سرسید اور ان کے رفقاء کے علاوہ ابتداء ہی سے اردو کے بہت سارے ادباء،شعراء،محققین و ناقدین مدارس کے مخصوص ماحول کے پروردہ رہے ہیں۔محمد حسین آزاد،خواجہ حسن نظامی،سید سلیمان ندوی،عبدالماجد دریابادی،عبدالباری ندوی،عبدالسلام سندیلوی،مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا مودودی،مولانا حسرت موہانی،مولانا ماہر القادری،مولانا عامر عثمانی،مولانا مارہروی،مولانا ابوالحسن علی ندوی،مولانا عثمان فارقلیط،سعید احمد اکبرآبادی،مولانا وحید الدین خاں۔غرض یہ فہرست لامتناہی ہے،اس کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔

اہل مدارس نے اپنی وقیع تصانیف کے ذریعے اس زبان کا دامن وسیع کیا ہے۔آج اسلامی کتب کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی زبان میں جمع ہے۔جن میں تراجم،تفاسیر،تشریحات،توضیحات،خطبات،مکتوبات،ملفوظات،بیاضات،مخطوطات،غرض صرف ونحو،بلاغت،لغت ہر ہر موضوع پر کتابیں شامل ہیں۔

**اہل مدارس کے لئے عصری جامعات میں داخلے کے مواقع:**

دنیا کے سب سے بڑے مدرسہ دارالعلوم،دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتویؒ نے مدارس سے فراغت کے بعد طلباء کو عصری علوم کی تحصیل کی بھی ترغیب دی تھی۔(۹) بانئ دیوبند کی اس دوراندیشی کا ثمرہ اب ظاہر ہو رہا ہے۔مدارس کے فارغین ایم اے،ایم فل اور پی ایچ ڈی وغیرہ میں بڑی تعداد میں داخلے لے رہے ہیں۔اور ایک دوسرے کے لئے فائدے کا سبب بن رہے ہیں۔بعض مدارس کی اسناد کو بعض جامعات نے بی اے کی سند کے مساوی تسلیم کر کے انھیں ایم اے میں داخلے کا مجاز قرار دے دیا ہے۔آج اردو ادب کی تدریس اور تحقیق کے شعبوں میں خاص طور سے جامعات میں طلباء کے داخلوں کا مدار بڑی حد تک مدارس پر ہے۔اسکولوں اور کالجوں میں زبان کے درجے میں کمزوری ہی کے ساتھ سبھی طلباء کے داخلے ہو جاتے ہیں۔لیکن کلیات و جامعات میں جہاں صرف اردو ادبیات کی تدریس و تحقیق کا کام ہوتا ہے،طلباء کی Feeding مشکل ہوگئی ہے اور یہ مشکل مدارس کے طلباء سے پوری ہو رہی ہے جو صلاحیت کے اعتبار سے بھی بہتر ہوتے ہیں۔اتر پردیش اور بہار وغیرہ ریاستوں میں مدرسہ بورڈ کا نظام موجود ہے۔جو تحتانی اور فوقانی سطح پر بھی مدارس کے طلباء کو سرکاری نصاب سے بہرہ ور ہونے اور عصری علوم سے استفادے کے دروازے کھلے چھوڑے ہیں۔

**اردو تحریکیں اور اہل مدارس:**

اردو میں زبان و ہیئت، املا و تلفظ، افکار و رجحانات،غرض دیگر طرح کے انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ہر تبدیلی ہمیشہ سود مند نہیں ثابت ہوتی۔مگر پھر بھی ادب میں اسے ایک صحت مند روایت گردانا جاتا ہے۔جہاں تک مدارس سے وابستہ نگارشات کا تعلق ہے وہ ادب کی کسی تحریک سے متاثر نہیں ہیں۔مدارس سے وابستہ تحریریں اپنی ایک ہی نہج پر گامزن ہیں۔بقول ڈاکٹر واثق الخیر

"اردو کشی کے اس دور میں اردو زبان کی بقاء مدارس سے مشروط ہے۔اس زبان کا نامیاتی ارتقاء اور تسلسل بھی مدارس پر ہی منحصر ہے۔اہل مدارس نے اردو کے احیا کے عملی اقدامات کئے۔رسم الخط کی تبدیلی،استعارات وعلائم میں تغیر،لسانی مزاج کو بدلنے کے خطرناک منصوبوں سے بھی سب باخبر ہیں۔ایسے پرخطر ماحول میں اردو کی ہیئت حقیقی یعنی اس کے رسم الخط کو مدارس نے برقرار رکھا۔اور اردو زبان کی اصلی روح اور اس کے تہذیبی حسن کا تحفظ مدارس نے ہی کیا۔زبان کی جمالیات اور حرکیات کو نئی توانائی عطا کی۔"(۱۰)

واثق الخیر کے خیالات سے اگر صد فی صد اتفاق نہ بھی کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مدارس کا اپنا ماحول ہوتا ہے، اہل مدارس کا ادب کی ہر پیش رفت سے متفق ہونا اپنے اسالیب کو ہم آہنگ کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے لئے اہل مدرسہ پر پسماندگی، فرسودگی اور دقیانوسیت کے الزامات صحیح نہیں ہیں۔

غرض اردو زبان کی ترویج واشاعت میں پچھلی دوصدیوں سے مدارس کا جو مثبت کردار رہا ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ مدارس سے فراغت کے بعد طلباء امامت وخطابت اور تعلیم وتعلم میں اسی زبان کو بطور وسیلہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا وسیع جال ہے جو غیر محسوس طریقے پر پھیلا ہوا ہے اور بے لوث زبان کی خدمت میں منہمک ہے۔ زبان کی خدمت کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے بھی یہ طبقہ زبان کی خدمت اور ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

مراجع ومصادر:


۱۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، از پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص ۱۷ ،مطبوعہ یونی ورسٹی پرنٹنگ پریس، دہلی، اشاعت ۱۹۶۴ء

۲۔ ''دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار'' از مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص ۷، ناشر شعبہ نشرواشاعت، ندوۃ العلماء، لکھنو

۳۔ ''کچھ اور چاہئے وسعت کے لئے'' از پروفیسر اختر الواسع ص ۱۰۳

۴۔ 'مدارس اسلامیہ، حقیقی کردار اور نصب العین کا تحفظ' از مولانا شوکت علی بستوی، مطبوعہ مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ، دارالعلوم، دیوبند، ص ۶۴

۵۔ 'مدارس اسلامیہ، حقیقی کردار اور نصب العین کا تحفظ' از مولانا شوکت علی بستوی، مطبوعہ مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ، دارالعلوم، دیوبند، ص ۶۴

۶۔ ''خون بہا'' از حکیم احمد شجاع، ص ۴۳۹

۷۔ ''کچھ اور چاہئے وسعت کے لئے'' از پروفیسر اختر الواسع ص ۱۱۰

۸۔ ''کچھ اور چاہئے وسعت کے لئے'' از پروفیسر اختر الواسع ص ۱۰۴

۹۔ 'مدارس اسلامیہ، حقیقی کردار اور نصب العین کا تحفظ' از مولانا شوکت علی بستوی، مطبوعہ مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ، دارالعلوم، دیوبند، ص ۶۴

۱۰۔ ''ہندوستانی مدارس اور اردو زبان کا فروغ'' از ڈاکٹر واثق الخیر

# اردو نظموں میں قومی یکجہتی کا پیغام

ڈاکٹر امان اللہ ایم بی
شعبہ عربی فارسی و اردو، مدراس یونی ورسٹی

اردو زبان نام ہی مصالحت، محبت آشتی اور ہم آہنگی کا ہے۔ اردو زبان ایک خاص ماحول کی پروردہ ہے۔ اس کا قدیم ادب قدرتی طور پر اس دور کی سماجی اور سیاسی تاریخ کا آئینہ دار تھا۔ دورِ جدید، وطنی تحریکات، نئے نئے فلسفیانہ نظریات اور عالم گیر تصورات کا دور ہے۔ اس سے پہلے تک ہمارا شعر و ادب صرف صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتا رہا، کبھی منظم اور کبھی غیر منظم انداز میں۔ اس 'یک جہتی' کے اہم اجزا کے مختلف روپ تھے۔

اردو کی خوش قسمتی تھی کہ ابتدائی دور ہی میں تصوف اور بھگتی کے اثرات کی بنا پر اس کے ادب میں انسانی عظمت کا نظریہ جگہ پا گیا۔ بالخصوص ہندوستان میں صوفیوں کی آمد نے ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کے لئے سونے پر سہاگے کا کام کیا، بھگتی تحریک میں ہندو مسلم اتحاد کے مشترک عناصر سے صوفیائے کرام بہت متاثر ہوئے دونوں روحانی تحریکوں نے دکن کی اس روایت کا آغاز شمال میں امیر خسرو اور جنوب میں حضرت گیسو دراز سے ہوا۔

نظیر اکبر آبادی نے کشن جی، موہن، مدن گوپال، برج راج، گون چریا، ماکھن اُچکّے، گووردھن، من ہرن وغیرہ نام بڑے چاؤ سے استعمال کئے ہیں۔ ان کی ساری نظمیں ایسی لگتی ہیں جیسے کسی (بھکتی کال کے) ہندی شاعر نے لکھی ہوں۔

دکنی حکومتیں جب تک برقرار رہیں لوگوں کی زندگی پُر سکون رہی، لیکن جیسے ہی شمال کے حکم رانوں کے ہاتھوں ان کا زوال شروع ہوا تو رعایا میں فطری طور پر بے چینی پھیل گئی۔

دنیا میں ہندوستان جیسا شاید کوئی اور ملک نہ ہوگا جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ رہتے ہیں۔ بھارت واسیوں میں مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اختلافات کے ساتھ لسانی اختلاف بھی ہے مگر ان میں بہت سی باتوں میں یکسانیت ہے۔ سب ایک دوسرے کے مذہب کی عزت کریں، ایک دوسرے کی تہذیب سے پیار کریں۔ ہر ایک کو ترقی کے مواقع ملیں تب ہی صحیح معنوں میں بھارت ایک ترقی یافتہ تہذیب یافتہ ملک بن سکتا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ مشترکہ تہذیب ہی بھارت کی پہچان ہے۔

اردو نظم گو شعراء نے جہاں مذہبی رواداری اور یکتا کے گن گائے وہیں مذہب کے ظاہری لوازمات جو خلوص سے عاری ہوں اس کی مخالفت بھی کی۔ امن، خیر سگالی اور یکجہتی کو کسی بھی مذہب سے جب حرف آئے تو اس کی مخالفت میں یوں احتجاج کرتے ہیں کہ؛

بلائے جان ہیں یہ تسبیح اور زُنار کے جھگڑے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں
اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

(چکبست)

وطن پرستی اور قومی یکجہتی کے پرچم کو بلند کرنے میں اقبال نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اقبال کو ہندوستانی جذبے کا پیامبر کہیں تو غلط نہ

ہوگا۔اسی طرح چکبستؔ نے بھی اپنی قومی نظموں سے ہندوستانیوں کے جذبہ حب الوطنی میں ابھارا ہے۔قوم کی شیرازہ بندی میں اہم رول ادا کیا ہے۔جب بھی ہندواور مسلمانوں کے درمیان دراڑیں پیدا ہوئیں تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور مخالفت میں آواز اٹھانے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرز ہندو دیکھ کر طرز مسلماں دیکھ کر
(چکبست)

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ قوم کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ لڑنا اور ملنا مثل پانی کی لہروں کے موجود ہونا چاہئے کہ اٹھتی ہیں ،ٹکراتی ہیں اور پھر ایک ہوجاتی ہیں:

کہتا ہوں میں ہندو مسلمانوں سے یہی
اپنی اپنی روش پر تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو، مگر ایک رہو

اقبالؔ یہ بھی چاہتے تھے کہ تمام مذاہب کے پیروکاروں کا ایک ہی تیرتھ، ایک ہی زیارت گاہ ہو جوایسی عظیم ہو کہ سب کے لئے مثال بن جائے۔اس زیارت گاہ میں سب کو پیار کی شراب پلائی جائے اور پریم ہی کے منتر، پریم ہی کی آیتیں پڑھی جائیں۔

دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اٹھ کر گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مئے پیت کی پلادیں

علی عباس امیدؔ کی نظم ''ہندوستان ایک ہے''میں شاعر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ہندوستان کی یکجہتی ایک مثال ہے....اور اسے ہندوستان کے ایک ہونے پر فخر ہے۔

صابرؔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کو ایک ہاتھ کی مختلف انگلیاں سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ پانچ انگلیاں مل کر ایک ہاتھ بنتا ہے..... اسی طرح مختلف مذاہب کے لوگ ایک پیارے دیش بھارت کی پہچان ہیں۔

اردو شاعری پر ہندو تہذیب کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔مریاداپرشوتم رام کو دس اوتاروں میں سے ساتواں اوتار مانا جاتا ہے۔وہ اپنی شجاعت، والدین کی اطاعت، انسانی ہمدردی اور رعایا کے تئیں پدرانہ سلوک کے سبب ہر دلعزیز شخصیت گردانے جاتے ہیں۔

منشی تلوک چند محرومؔ ''نیرنگ معانی''نظم میں کہتے ہیں کہ رام کے نام سے من کو شانتی ملتی ہے۔''رام چرت'' پڑھنے سے بھکتی کا انمول خزانہ حاصل ہوتا ہے۔

اردو کے قصیدوں کی طرز پر اقبال نے شری رام کی مدح میں یہ نظم لکھی اسی لئے وہ رام کو تلوار کا دھنی کہہ گئے جبکہ رام تیر کمان کے دھنی تھے۔

منور لکھنوی نے ''رام کی باتیں'' عنوان سے ایک طویل نظم لکھی ہے اس مخمس کے مختلف بندوں میں رامائن کے خاص خاص واقعات کا ذکر ہے جو ذات یزداں نے رام کی حیثیت سے اوتار لے کر کائنات کو باطل کے ظلم وستم سے محفوظ کرنے کے لئے کر دکھائے اور ایک مثالی انسان اور مثالی حکمراں کی مثال دنیا کے سامنے رکھی۔

اردو کے شاعر ہمیشہ ہی رام اور رحیم کا نام ساتھ ساتھ لیتے نظر آتے ہیں غلام حسین اچل پوری کہتے ہیں:

مسلمان اللہ کا نام بولیں ہندو بھی ہر ہر جبیں رام بولیں

منشاء الرحمٰن منشاء کا کہنا ہے کہ رام بولو یا رحیم، بات تو ایک ہی ہے:

بندہ ہے کوئی رام کا کوئی رحیم کا ہر کوئی نام لیتا ہے رب کریم کا

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کھڑی بولی ہندی اور اردو کا جنم ہوا۔ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ہر موضوع پر ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ ہندوستانی تہذیب کو گلے لگا کر علاقائی زبانوں میں ادب کے شہ پارے تخلیق ہوئے۔

محمد سلیم خاں کی نظم ''قومی یکجہتی'' میں ہر ہندوستانی کے دل کے جذبات عیاں ہوتے ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ بھارت کے وہ لوگ جو آپس میں نفرت کے بیج بوتے ہیں وہی درحقیقت ہمارے دشمن ہیں۔ ان سے بچنا اور دیش کی ایکتا کو قائم رکھنا ہمارا پہلا فرض ہونا چاہیے:

روح کی ٹھنڈی، دل کا سکوں ہے، آنکھ کا اپنی تارا ہے
اپنے وطن کا ذرہ ذرہ جان سے ہم کو پیارا ہے
قدم قدم پہ مندر مسجد، گرجا ہے گرودوارہ ہے
اپنے وطن کا کیا کہنا یہ سارے جگ سے نیارا ہے
پیار ہے مذہب ہم لوگوں کا اور یہ ہم کو پیارا ہے
بیج جو نفرت کا بوتا ہے دشمن وہی ہمارا ہے
بھارت کے اس تاج محل میں اپنے لہو کا گارا ہے
ہم بھارت کے رکھوالے ہیں بھارت دیش ہمارا ہے
آؤ ہم مل جل کے مٹادیں، آپس کے سب جھگڑوں کو
ہندو مسلم، سکھ عیسائی، ایک ہوں اپنا نعرہ ہے
نسل و زباں کے نام پہ ناحق آپس میں لڑنے والو
قوم کی ایکتا قائم رکھنا، پہلا فرض تمہارا ہے

سردار احمد ''دیوالی'' نظم میں دیوالی کو سولہ سنگار کی ہوئی دلہن سے تشبیہ دیتے ہیں اور امید کے چمن پہ چھائی ہوئی بہار کہہ کر اس کا بیان کرتے ہیں۔ ادیب مالیگانوی نے دیوالی کے تیوہار پر بچے بڑے سب کی خوشیوں کا بیان کیا ہے اور دیوالی کی رات سب کو لکشمی کا وردان حاصل ہو، سب خوشحال ہو جائیں، یہ نیک خواہشات ظاہر کی ہیں۔

مومن خاں شوق نے دیوالی کا بڑا خوبصورت پیغام ہم تک پہنچایا ہے۔ قتیل شفائی ''دیوالی'' نظم میں تنہائی کا درد بیان کرتے

ہیں۔

حضرت محمدؐ سے عقیدت رکھنے والے مسلم شعراء کے کلام میں یہ عقیدت جا بجا جھلکتی ہے مگر دوسرے مذاہب کے شعراء بھی انہیں عظیم فلاسفر، رہنما اور انسانیت کے پجاری کی شکل میں دیکھتے اور اپنی شاعری میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جب عقیدت اور فلسفہ آپس میں مل جائیں تو نعت گوئی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

جگن ناتھ آزادؔ نے حضورؐ کی خدمت میں سلام پیش کیا ہے۔ جگدیش مہتہ دردؔ نے خدا کے رسول کی شان میں عقیدت کے پھول اپنے اشعار میں چڑھائے ہیں۔ پنڈت ہری چند اخترؔ نے محمد عربیؐ کو انسانیت کا نام اونچا کرنے والا اقرار دیا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کہتے ہیں کہ وہ محمدؐ اور مدینہ کے شیدائی ہیں۔ چندر پرکاش جوہر بجنوری محمدؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی یہ خواہش ہے کہ خدا کے پیارے رسول کی محبت ہمیشہ ان کے دل میں بنی رہے۔ سحرؔ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ محمدؐ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ سب کے ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری بھی اس کی حمایت کرتے ہیں کہ محمدؐ کی جگہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے دلوں میں بھی ہے۔ دتو رام کوثریؔ کے مطابق ہندو بھی محمدؐ کو نظر کرم کے محتاج ہیں۔ کالی داس گپتا رضاؔ محمدؐ کے نام میں بے خود ہو جانے کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ کرشن موہن کا ماننا ہے کہ جام مصطفیٰؐ، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو چھوٹے بڑوں کو، امیر غریب کو سب کو ایک کر دیتا ہے۔

ستیش چندر سکسینہ طالبؔ دہلوی، محمدؐ کے دامن کو تھامے رہنے ہی میں خیریت سمجھتے ہیں۔ پنڈت مہابیر بھی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ روز قیامت محمدؐ کے امتی عذاب سے نجات پا جائیں گے۔ سالک رام سالکؔ مدینہ کی مٹی کو آنکھوں میں سرمہ کی طرح لگانے کو خوش قسمتی جانتے ہیں۔ گرسرن لال ادیب لکھنوی حضرت محمدؐ کو پیار کی گنگا بہانے والا اور محبت کا سفیر گردانتے ہیں۔

عید کا تیوہار یکجہتی کا تیوہار ہے۔ اس روز ہندو مسلم، چھوٹے بڑے امیر غریب ایک دوسرے کے گلے مل کر پرانی عداوت بھول جاتے ہیں۔ عید کو اسی لئے ''ملن کا تیوہار'' بھی کہا جاتا ہے۔ کرشن کمار مینک کو یقین ہے کہ عید کے دن کا ملن ملا نا جنگ کے بادلوں کو بھی ہوا میں اڑا دینے کی قوت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو عید پریم کے دھاگے میں جوڑتی ہے۔ رویندر جین عید کی خوشیوں کو سویوں کی مٹھاس ہی سے نہیں، محبت اور اخلاق کی مٹھاس سے بھی میٹھا کرنا چاہتے ہیں۔ نازش پرتاب گڈھی نیان غریبوں اور دکھیوں کی عید کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے جو نہایت صبر و شکر کے ساتھ عید مناتے ہیں۔

اردو زبان کے فروغ اور اس کی مقبولیت بڑھانے میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ تمام مذاہب کے ادیبوں نے اہم رول نبھایا ہے۔ بہت سے عیسائی شاعروں نے مثنوی کو اہمیت دی۔ مثنوی اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ صاحب شعرالعجم کا کہنا ہے کہ ''مثنوی میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہوتے ہیں۔ مدح و تعریف بھی کی جاتی ہے۔ باغ، جنگل، پہاڑ، بیابان کے منظر بھی دکھائے جاتے ہیں۔

اردو کے عیسائی شعراء میں لیوگارڈنر صبرؔ، جان تھاس توماس، کپتان موسیس مانوک، اسٹیفن اسفان، ایس ڈبلیو ٹیلر عابدؔ، فلیکس گارڈنر، جارج برنش شوزؔ، رابرٹ گارڈ اسبقؔ بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ عیسائی شعراء کی اردو نوازی اور اردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو ادب میں مذہبی رجحان یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے ہندو بھائیوں سے اپنی محبت و خلوص کا پیام دیا تو ہندوؤں نے بھی اسی گرم جوشی سے مسلمانوں کے جذبات کا جواب دیا ہے۔ اردو کے کئی ہندو شاعروں نے پیشوائے اسلام کی بارگاہ میں زانو عقیدت تہہ کیا ہے۔

عشرت لکھنوی کی غزلوں میں ایک شعر نعتیہ ضرور ہوتا تھا۔ ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہوں؛

آیا جو نام پاک محمد زبان پر صلی علیٰ کا شور ہوا آسمان پر

حضرت امام حسین نے اس جہاں کے ہر ایک انسان کے لئے ایک پیغام بھیجا ہے ان کا پیغام صرف مسلمان یا ہندو کے لئے نہیں تھا۔ متعدد ہندو شعراء نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے؛

کافر کوئی کہے تو کہے امن کو مگر  اس کے دل و جگر میں قیام حسینؓ ہے  گوپی ناتھ امن

اف رے قربانی عظیم اس کی  مردِ میدانِ کربلا کو سلام

بندگی جس پہ ناز کرتی ہے  دل سے اس بندۂ خدا کو سلام  منور

کرشن گوپال مغموم نے ہندوؤں کے جذبۂ غم کی بنیاد انسانیت کے وسیع تر مفہوم میں یوں کہا تھا کہ؛

غیر مسلم ہیں شریکِ غم مسلمانوں کے ساتھ
آج ہمدردی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ

انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ

درس آموز جہاں ہے اب بھی تعلیم حسینؓ
سب کریں جامِ شہادت پی کے تعظیم حسینؓ

رام پرکاش ساحر نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے کہ

ہے حق و صداقت مرا مسلک ساحر  ہندو بھی ہوں شبیرؓ کا شیدائی بھی

اہلِ بیت سے اپنی محبت کا اظہار رام نرائن جگر نے یوں کیا ہے کہ

آتی ہے بام عرش سے لب پر مرے صدا  دل سے جگر بھی آلِ نبیؐ کا غلام ہے

حضرت امام حسینؓ نے امن کے قیام کے لئے یکتائی اور یکجہتی کا پیغام دیا تھا تو گوپی ناتھ امن یوں گویا ہوئے ہیں جو آج کی صورت حال پر پوری طرح صادر نظر آتا ہے کہ؛

رنگ بدلیں ہندو و مسلم وطن میں کتنے ہی
امن کو رہنا ہے آخر تک پرستارِ حسینؓ

اردو کے جن شعراء نے رام کے کردار، ان کی شخصیت اور رامائن کے واقعات پر نظمیں لکھی ہیں ان میں بابو گرو نارائن کی سیتا سوئمبر، مکندلال خوشدل کی ''لکشمن پرشوتم مکالمہ'' طوطا رام پریمی کی ''رامائن اُشومیگھ'' ظفر علی خاں کی ''ایک رشی کے داغ جگر کی کہانی راجہ دشرتھ کی زبانی'' اور ''شری رام چندر سے خطاب'' سرور جہاں آبادی کی ''سیتا کا اصرار'' دتاتریہ موہن کیفی کی، ''بن باس کی صبح'' میلا رام وفا کی ''راجہ دشرتھ کے آخری الفاظ'' ملوک چند محروم کی ''سیتا ہرن'' رام کا ذکر خیر، ''جشن چراغاں'' اور ''فتح لنکا'' جگت موہن رواں کی ''تارا کی فریاد'' شاد عارفی کی دسہرہ اشنان'' مہاراجہ بہادر برق کی ''بن باسیوں کی لنکا سے رخصتی'' منور لکھنوی کی ''بھگوان رام کی عظمت'' اور اقبال کی ''رام اور ساغر نظامی کی بھی رام'' نظمیں مشہور ہیں۔ رام کی شخصیت اور رامائن کے اہم واقعات کو اردو شاعری میں کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش ہیں۔

صمد یار خاں ساغر نظامی جو سیماب اکبر آبادی کے مرید بھی ہیں انھوں نے اپنی نظموں کے لئے ہندوستانی زندگی، ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات کے عام عنوانات منتخب کر کے ان کے اظہار خیال کے لئے عام، سلیس اور دلکش الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ سروجنی نائڈو بادہ مشرق کے دیباچہ میں لکھتی ہیں ''میرے نوجوان دوست۔۔۔۔ ساغر کا ریشہ ریشہ ہندوستانی ہے، اس کی شاعری مادرِ وطن سے ماخوذ ہے، اور

مادرِوطن ہی سے اس کا انتساب ہے۔'' (دہلی، اپریل ۱۹۳۵ء بادہ مشرق)۔ ساغر نے رام کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا ہے قومی یکجہتی کے لئے ان کی نظمیں مشہور ہیں۔

ساغر نظامی نے'' بادۂ مشرق'' نظم میں رام کی دلکش شخصیت، اُن کی شجاعت ور ہر دلعزیزی کا ذکر کیا ہے:

ششدل کا تیاگی، روح کا رسیا
خود راجہ اور خود ہی پرجا

سب سے الفت کرنے والا
قول کا سچا بات کا پکا

دھیان کی گنگا اس سے پھوٹی
گیان کی جمنا اس سے پھوٹی

سچائی کا پرچم تھا وہ
پریم کا بانکا بالم تھا وہ

روح شجاعت، جانِ شجاعت
آنِ شجاعت، شانِ شجاعت

عدل کا پیکر رام کی دنیا
شکتی اور بھکتی کا ستارا

دوش پہ اس کی نور کی چادر
گھنگریالے بال کمٹ پر

بھارت پیارا، راج دُلارا
کوشلیا کی آنکھ کا تارا

شریمد بھگوت گیتا جس کا منظوم اردو ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر لوگوں نے اپنے اپنے طور پر ترجمہ کیا ہے۔ محمد اجمل خاں نے'' بھگوت گیتا'' کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے شائع کیا تو اصلی بھگوت گیتا اردو ترجمہ سرگباشی بابو بھگوان داس بھاگو پنشر لکھنو نول کشور سے شائع کیا ہے۔ ویسے بھگوت گیتا کو صرف ہندومت کی مذہبی کتاب کہنا درست نہیں ہے۔ بقول نثار احمد فاروقی'' آج بھی ہر اس مسلمان عالم کے لئے جو وسط ایشیاء اور جنوب مغربی ایشیا میں اسلامی تصوف اور اسلامی فکر کی نشو ونما کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتا ہو بھگوت گیتا کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔

غرض ہندوستان کثرت میں وحدت کی شان کی بہترین مثال ہے۔ یہاں مختلف زبان بولنے والے، مختلف مذہب وعقائد کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ہندوستانی عناصر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ یہاں کے ادیب وشعراء نے اپنی تخلیقات میں قومی یکجہتی کے ان تمام عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ مستقل نظموں کے حوالے اور متفرق شعرا کی مثالیں دی جائیں تو ان کے لئے بجائے خود ایک ضخیم کتاب چاہئے۔ اس مختصر مضمون میں میں نے بطور نمونہ چند نظموں کے اشعار ہی پر اکتفا کیا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ادب کا کوئی دور، ان چیزوں کے تذکرے سے خالی نہ تھا۔ ہر ادیب وشاعر نے ہندوستان کی یکتائی، قومی یکجہتی، یگانگت اور میل وملاپ کو فروغ دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

# مصباح الحیات


از: الحاج منصور علی خان قادری

ایڈیٹر ہفت روزہ ''تسخیر انسانیت'' بنگلور

موبائل: 9845658861


یہ تصنیف سید محمد حیات علی میسوری کی 137 سال پرانی ہے۔ آپ مولوی میر حیات صاحب میسور کے نام سے مشہور ہیں، آپ نے ایک طویل عمر پائی، آپ کی وفات 81 سال کی عمر میں مطابق 1281ھ میں ہوئی۔

آپ کے دین و مذہب کے معتدد موضوعات پر نظم اور نثر میں باون رسالے طبع ہوئے اور سارے ملک میں انہیں مقبول عام نصیب ہوا اس کے علاوہ فارسی میں بھی آپ نے کچھ رسائل چھوڑے ہیں۔ ''مصباح الحیات'' کئی بار شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب جہاں احکام شریعت جیسے فقہ، دینی مسائل، عقائد اور دینی احکام کی رہنمائی کرتی ہے وہیں اہل طریق کے لئے ایک بہترین تصنیف مانی گئی ہے۔ جس میں طریقت کی تعلیم کے کئی ابواب جیسے کلید معرفت، رسالۂ آبِ حیات، دستور الایمان، راز الایمان اور فوز الایمان وغیرہ ابواب شامل ہیں۔ یہ قدیم تصنیف 137 سال پرانی ہے، اس لحاظ سے اس کی عبارت آج کل کی ادبی زبان سے کچھ الگ ہے۔ اس میں دکنی، دہقانی، عربی اور فارسی کے الفاظ اور اُس دور کے عام فہم الفاظ شامل ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کتاب کے کچھ خاص ابواب اہل طریق کی تعلیم و تربیت و ہدایات پر مستعمل ہیں اور طریقت کی اصطلاحات پائے جاتے ہیں۔ مقامِ ناسوت، ملکوت، باہوت، فنا و بقا، عینیت، غیریت،، ایمانِ سابقہ، وحدت الوجود، وحدت الشہو دوغیرہ جو مبتدی سالک کی سمجھ سے باہر ہیں۔ طریقت کے یہ دقیق مسائل کا سمجھنا آسان نہیں۔ اس کے حصول کے لئے مرشد کامل کی صحبت و تعلیم درکار ہے۔

اس کتاب میں پہلے احکامِ شریعت کو سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے فقہ، حدیث، عقائد، دینی احکام کی تعلیم دی گئی ہے اور پھر طریقت کے کئی نکات و رموز کو سمجھنے اور عمل کرنے کی تاکید ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔؎

سیکھ عقائد اس قدر اے دل نواز تا درست ہووے تیرا روزہ نماز

من عرف کا علم سیکھ تو بعد ازاں عمر اپنی کھو نکو تو رائیگاں

طریقت کے اسرار و رموز جو بآسانی سمجھ کر عمل کر سکتے ہیں اور سالک کے لئے ان تمام باتوں کا جاننا اور عمل کرنا بے حد ضروری ہے۔

مصنف کے حالات زندگی:

(۱) مصنف کا پورا نام سید محمد حیات علی بن سید محمد یوسف حُسین ہے۔ عظیم آباد (ریاست میسور) متوطن تھے۔ عظیم آباد دراصل قصبۂ بیرن درگ کولار کے قریب واقع ہے۔ حضرت میر حیات کی ابتدائی تعلیم حضرت مکان ویلور میں ہوئی، حضرت محوی سے بیعت کی، علامہ باقر آگاہ سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت شاہ کمال سے خرقہ خلافت پایا۔ ۸۱ سال کی عمر میں مطابق ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی۔ دس یا بارہ سال کی عمر میں اقطابِ ویلور کی خانقاہی مدرسہ میں داخلہ لیا بعد میں وہی مدرسہ ''دارالعلوم لطیفیہ'' کہلایا۔ سجادہ نشین حضرت مولانا سید شاہ ابوالحسن معروف بہ محوی ویلوری قدس سرہٗ ۱۲۴۳ـ۱۱۸۶ھ مدرسہ لطیفیہ میں پانچ سال زیرِ تعلیم رہے۔

آپ کے ساتھیوں میں حضرت محوی کے فرزند حضرت سید شاہ عبدللطیف قادری نقوی المعروف بہ شاہ محی الدین قطب ویلور

تھے۔ویلور میں آپ منداولہ،تفسیر،حدیث،فقہ،فلسفہ،تصوف،علم طب حاصل کر کے مدراس کے علماء وفضلاء،ملک العلماء حضرت علامہ باقر آگاہ ویلوری (متوفی ۱۲۲۵) سے اور عبدالعلی مدراسی سے خوب فیضان حاصل کیا۔یہ وہ دور تھا جبکہ جنوبی ہند کے مشہور صاحب تصنیف بزرگ جامیٔ دکن حضرت شاہ کمال کڈپوی (متوفی ۱۲۲۴) اکثر شہر میسور تشریف لاتے تھے۔حضرت باقر آگاہ اور حضرت بحرالعلوم سے شاہ کمال کا یارانہ تھا۔حضرت حیات شاہ کمال کڈپوی سے متاثر ہوئے،آپ نے اپنے مرشد شیخ طریقت حضرت محوی سے اجازت لے کر شاہ کمال کی طرف رجوع کیا اور طالب ہوئے۔شاہ صاحب پہنچے ہوئے ولی کامل بزرگ تھے وہ حضرت محوی ویلوری سے عمر میں بڑے تھے۔حضرت حیات نے شاہ کمال سے بیعت کی اور شاہ کمال کے خلفاء میں شامل ہوئے اور اپنے وطن میسور تشریف لائے اور تعلیم وتدریس طباعت وحکمت میں لگ گئے۔

آپ کا نکاح ٹیپو سلطان کے عہد کے قابل قدر مصنف شہرت یافتہ شاعر وادیب منتجم سلطانی منشی غلام حسین عاصی (متوفی ۱۲۸۵) کی دختر نیک اختر سے ہوا۔آپ دربار ٹیپو سلطان سے وابستہ تھے آپ ہی نے سلطان کی شہادت کا نجوم سے اندازہ لگایا تھا۔سلطان کی شہادت کے بعد منشی غلام حسین منتجم عاصی سری رنگ پٹن سے ہجرت کر کے میسور آ گئے۔میسور کا راجہ کرشنا راج وڈیر سوم کی عہد حکومت نے آپ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اپنے دربار میں منتجم و منشی کے عہدہ پر معمور کیا۔آپ کی سبکدوشی کے بعد حضرت میر حیات کو فارسی کے منشی کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔آپ کی زوجہ محترمہ بہت جلد چل بسیں تو شہر میسور کے ایک اور نامور بزرگ حضرت سید حسین علی شاہ قادری نے اپنی لڑکی سے نکاح کیا،آپ کا وطن سکندر آباد تھا۔شاہ صاحب بمبئی تلچری ہوتے ہوتے ہوئے میسور تشریف لائے۔

بھوپال کے نواب قدسیہ بیگم شاہ صاحب کی مریدہ تھیں۔میسور پہنچے تو آپ کے کشف وکرامات کو دیکھ کر مہاراج کرشنا راج وڈیر آپ کا معتقد ہو گیا۔حضرت حیات کو شاہ صاحب نے سری رام پیٹ میسور مسجد کے روبرو ایک کشادہ مکان دے دیا تھا۔اسی مکان میں آپ اپنی سادی زندگی گزاری اور ۱۸۶۵ء میں وفات پائی۔وفات کے بعد شاہ صاحب واپس سکندر آباد لوٹ گئے۔میر حیات صاحب کی نرینہ اولاد نہیں تھی (ماخوذ)

(۲) مولوی میر حیات شہر میسور کے سب سے بڑے مصنف تھے۔آپ مدرسۂ لطیفیہ ویلور کے فارغ جید عالم تھے اور بڑے اچھے خطاط اور طبیب صادق بھی تھے۔مہاراجہ کے دربار میں فارسی منشی کے خدمات پر مامور تھے۔آپ نے دین ومذہب کے متعدد موضوعات پر نظم ونثر میں باون رسالے لکھے جو فقط میسور اور بنگلور میں ہی نہیں بلکہ ملک کے مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ طبع ہوئے اور سارے ملک میں انہیں قبول عام نصیب ہوا۔اس کے علاوہ فارسی میں بھی آپ کچھ رسائل چھوڑے ہیں۔آپ کی تصنیف مصباح الحیات اسی طرح کئی بار شائع ہوئی۔

کچی میمن مسجد میسور میں ایک کتبہ نگار ہوا ہے جس میں ''ابنائے کعبہ ثانی شدہ زا'' تحریر ہے۔جس سے ۱۲۶۹ھ تاریخ نکلتی ہے،اور یہ تاریخی مادہ حضرت میر حیات میسوری مصنف مصباح الحیات کا لکھا ہوا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب تقریباً 135 سال پرانی ہے۔

میں حضرت محمد علی،بی اے بی ایڈ ادیب کامل (علیگ) وظیفہ یاب اردو منشی،چکمگلور کا قلب کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مندرجہ بالا مضمون کو اپنی کتاب نایاب ''گنجینۂ ہدایت'' میں تحریر کیا ہے،جون 2019ء میں شائع ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆

# مختصر داستانِ حضرت صابر پیا کلیریؒ

از: صوفی کے سید احمد ابو العلائی

سابق لکچرار جغرافیہ، دیانندا کالج بنگلور

موبائل: 8892606937

حضرت مخدوم سید علاؤالدین علی احمد صابر پیا کلیریؒ کا نسبی تعلق سادات خاندان سے ہے اور صحیح النسب سید ہیں۔آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسینؓ سے جاملتا ہے۔والد کی طرف سے نسب نامہ حضرت مخدوم سید علاؤالدین علی احمد صابر پیاؒ، بن سید عبداللہ بن سید فتح اللہ بن سید نور محمد بن سید احمد بن سید غیاث الدین بن سید بہاؤالدین بن سید داؤد بن سید تاج الدین بن سید محمد اسماعیل بن سید امام ناطق موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادقؒ بن سیدنا امام حسینؓ بن مولیٰ علی مشکل کشا۔

آپ کی والدہ محترمہ کا نام ہاجرہ ہے اور ان کے والد کا نام قاضی جمال الدین سلیمان ہے اور جمال الدین کی بڑی بیٹی اور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی بڑی بہن ہیں۔رات بھر خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتیں۔حضرت بی بی ہاجرہ کا سلسلہ نسب حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔

**آپ کی پیدائش و کرامات:** ملک افغانستان میں شہر حرات جہاں آپ کے والدین سکونت اختیار کی تھی وہیں ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ میں تہجد کی نماز کے وقت پیدا ہوئے، جب آپ پیدا ہوئے تو سارے گھر میں خوشبو پھوٹ پڑی تھی۔آپ کی دایا بشری بنت ہاشم کا بیان ہے، جس وقت آپ اپنی والدہ محترمہ کے پیٹ سے باہر آئے تو آپ کا سر قبلہ کی طرف تھا اور پاؤں میری طرف، جس آپ کو غسل دینے کے لئے ہاتھ لگائی تو میرے ہاتھ کانپ جاتے تھے اور ہاتھوں میں نا قابل برداشت سوزش (جلن) بھڑکا پیدا ہو جاتی تھی، جب میں یہ شکایت آپ کی والدہ محترمہ کو کی تو آپ نے مجھ سے کہا، دایا پہلے تو غسل کرا سکے بعد بچے کے جسم کو ہاتھ لگانا، پھر دایا نے وضو کر کے غسل کرایا۔آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کی والدہ کو خواب میں سرکارِ دو جہان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے اور کہے کہ آنے والے بچے کا نام احمد رکھنا، بعد میں ایک رات حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کی والدہ کو فرمایا کہ اس بچے کا نام میری نسبت سے علی رکھنا اور ایک بزرگ گھر پر تشریف لائے اور آپ کے والد ماجد سے کہا کہ اس بچے کا نام علاؤالدین، اس کے بعد دونوں ناموں کو ملا کر علاؤالدین علی احمد۔

حضرت مخدوم علی احمد صابرؒ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو آپ کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، آپ کو اس کا سخت صدمہ ہوا، والد ماجد کے انتقال کے بعد آ کی والدہ محترمہ کی زندگی بڑی غربت میں بسر ہونے لگی اس کا اظہار کسی نہیں فرماتی تھیں، علی احمد صابر پیکر صابر تھے دن بھر تھوڑا سا پانی پی لیتے اور اگر سوکھی روٹی مل جاتی تو روٹی کے ٹکڑے کھا لیتے اور زیادہ تر خاموش رہتے تھے ساری رات

عبادت میں گزار دیتے جس کمرہ میں آپ عبادت کرتے وہاں سے یہ آواز آتی کہ میں ظہور اللہ ہوں۔

**پاک پٹن میں پہلی کرامت** : جب آپ کی والدہ محترمہ آپ کو پاک پٹن لے گئیں تو اُس وقت یعنی بدھ کے دن ۶۰۹ھ ۱۲۱۰ء آپ کی عمر گیارہ برس کی تھی، جب آپ کی والدہ بابا فریدؒ کی گود میں اپنے لخت جگر کو دیا تو صابر پیا کو ایک کیفت سی طاری ہوگئی، اپنے ماموجان بابا فرید سے کہا کہ آج سے تین سال بعد میرے دادا حضور حضرت عبدالوہاب سیف الدین کا انتقال ہو جائے گا اس پر بابا فرید نے فرمایا بیٹا یہ کیسے پتہ کہ تم یہاں اور تمہارے دادا بغداد میں، اس پر صابر پیا نے فرمایا کہ میں نے اپنے دل کی طرف دیکھا تو والد کا چہرہ سامنے آیا اور داہنے ہاتھ کی تین انگلیاں میری طرف اٹھائی جو موت کی نشانی ہے، یہ سن کر بابا فریدؒ نے آپ کو سینے سے لگالیا اور لگا ناہی تھا کہ بابا فریدؒ کی عجب کیفیت ہونے لگی اور آپ اس حالت میں بار بار کہتے کہ مرحبا فرزند علی احمد تم بچپن سے ہی ولی ہو۔ ایسا ہی ہوا کہ تین سال بعد آپ کے دادا عبدالوہاب سیف الدین کا بغداد میں انتقال ہوگیا۔

**تقسیم لنگر** : حضرت صابر پیا کی والدہ تین سال تک اپنے بھائی بابا فرید کے ہاں رہنے کے بعد حرات چلی گئیں ، جانے سے پہلے بھائی سے ایک نصیحت کرگئی کہ میرے بچے کے کھانے پینے کا خیال رکھنا، بارہ سال بعد میں واپس آؤں گی اور اس کی شادی آپ کی لڑکی سے کروں گی۔ اسی وقت بابا فرید نے صابر پیا کو بلوایا اور لنگر تقسیم کرنے کا حکم دے دیا، آپ کی والدہ بہت خوش ہوئیں اور محبت بھری نگاہوں سے فرزند کو پیار کیا اور واپس چلی گئیں۔ آپ دن میں دو بار لنگر تقسیم کرتے ایک صبح کے وقت اور دوسرا مغرب کے بعد اور پھر حجرہ شریف میں لے جاتے اور عبادت میں مشغول ہوجاتے۔ آپ نے غالباً بارہ سال تک لنگر تقسیم کیا اس کے درمیان کسی نے بھی آپ کو کچھ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی والدہ بارہ سال بعد پاک پٹن آئیں اور اپنے بیٹے کو دیکھا تو حیران رہ گئی کہ ان کا فرزند بہت ہی کمزور ہوگئے ہیں اس بات کو لیکر اپنے بھائی بابا فرید سے فرمایا کہ میرے بچے کو بارہ برس تک کچھ بھی کھانے کو نہیں دیا اس پر بابا فریدؒ نے فرمایا میرے علی احمد کو پورے لنگر کا مالک بنایا تھا اس پر آپ کو بلا کر پوچھا تو آپ نے فرمایا، ماموں جان آپ نے مجھ کو لنگر تقسیم کرنے کو کہا تھا لنگر کھانے کو نہیں، اس بات پر بابا فرید نے صابر پیا کو اپنے سینے سے لگالیا اور بہن کو مخاطب ہوکر کہا یہ بچہ صابر کہلانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس دن سے آپ صابر پاک کے نام سے مشہور ہوگئے۔

**آپ کا نکاح** : کچھ دن گزرنے کے بعد والدہ نے اپنے بھائی بابا فرید سے فرمایا کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنی بیٹی خدیجہ کی شادی میرے صابر سے کردیجئے۔ اس پر بابا فرید نے فرمایا کہ مخدوم صابر اس لائق کے نہیں کہ ان کی شادی کی جائے، وہ شادی سے بہت دور ہیں، ہوش میں نہیں رہتے۔ اس پر آپ کی والدہ کو بابا فرید کی بات سن کر بہت دکھ ہوا، اور کہنے لگیں کہ میرا صابر یتیم ہے اور میں غریب ہوں اس وجہ سے آپ اپنی لڑکی کی شادی میرے صابر کے ساتھ نہیں کرنا چاہتے۔ بہن کے ان کلمات بھائی کے دل پر اثر کیا۔ آپ کی والدہ ۲۱ رشوال بدھ کے دن عصر کی نماز کے بعد بابا فرید کی دختر خدیجہ کا نکاح صابر پیا سے کردیا۔

نکاح کے بعد آپ کی والدہ نے دولہن کو حجرہ پہنچادیا اس وقت آپ نفل نماز میں مشغول تھے۔ بی بی خدیجہ آپ کی خدمت میں دست بستہ کھڑی رہیں، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے سامنے عورت کھڑی ہوئی نظر آئی، آپ نے اس عورت سے پوچھا تم کون

ہو؟ اور کیوں کھڑی ہو؟ یہ سن کر عرض کیا میں آپ کی دولہن ہوں۔ تو صابر پیا نے کہا خدا ایک ہے وہاں دوسے کا کیا کام، ابھی صابر کے منہ سے یہ کلمات پورے ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک زمین سے آگ کے شعلے نکلے اور دولہن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ آپ کی والدہ کو اس دردناک موت کا پتہ چلا تو انہوں نے حجرہ کا دروازہ کھلوایا۔ یہ دیکھا کہ صابر نماز میں مشغول ہیں اور دولہن اللہ کو پیاری ہوگئی ہے۔ والدہ نے غصہ کی حالت میں آپ کی کمر پر ہاتھ سے مار کر فرمایا تمہارے ماموں کی بیٹی سے تمہاری شادی کی تھی تم نے دولہن کو کیا کر دیا بتاؤ میں تمہارے ماموں کو کیا جواب دوں گی اور کیا منہ دکھاؤں گی؟ تو آپ نے کہا امی جان یہ اللہ کی مرضی تھی۔ دولہن کی اچانک موت سے والدہ کے دل پر بڑی گہری چوٹ پہنچی اور بیمار پڑھ گئیں اور چند دنوں بعد ۲ محرم ۶۱۴ھ جمعہ کے دن آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

**حضرت بابا فرید کے ہاتھ پر مرید ہونا:** حضرت بابا فرید فرماتے ہیں کہ صابر کو اپنے ہجرے میں نو سال ہوگئے تو میں نے بموجب الہام باطنی صابر کو اٹھایا، بابا فرید ۱۲۱۷ء میں صبح کے وقت صابر کے حجرہ میں تشریف لے گئے اور دیکھا کہ صابر حالت استغراق میں ہیں انہیں اپنا کچھ ہوش نہیں۔ بابا فرید ان کے کان میں سات بار کلمہ شہادت پڑھا تو صابر نے بابا فرید کو سلام کیا۔ بابا فرید انہیں حجرہ سے بار لے آئے اس وقت آپ کو تھوڑی تھوڑی بے خودی سی تھی۔ پھر عصر کی نماز کے بعد حاضرین کے سامنے صابر پیا کو اپنے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ میں داخل کیا۔ یعنی آپ کو مرید کیا اور اپنی کلاح مبارک پہنادی اور قرقہ مقدسہ اپنا اڑھا دیا۔ بیعت ہونے کے بعد آپ دن میں ٹھیک رہتے اور رات میں استغراق کی حالت میں ہوجاتے اور رات بھر یادِ الٰہی میں گزارتے اور ۲۷ سال اسی طرح مجاہدات اور بابا فرید کی تعلیم پر دل سے عمل کرتے۔ اس کے بعد بابا فرید نے اللہ کے حکم سے آپ کو خلافت عطا کی اور کہا کہ تم کلیر شریف کے صاحب ولایت ہو۔ کلیر شریف جاؤ اور خدا کے بندوں کی خدمت کرو اور ساتھ میں علیم اللہ عبدال خادم کو بھی آپ کے ساتھ کلیر روانہ کر دیا۔

**کلیر شریف کو روانگی:** ۱۲۵۳ء پیر کے دن علیم اللہ عبدال کے ساتھ کلیر شریف پہنچے اور ایک بوڑھی عورت گلزاری روغن میں مکان میں مقیم ہوئے اور حسب معمول عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا چرچہ چاروں طرف پھیلنے لگا۔ آپ اپنے پیر و مرشد حضرت بابا فرید کی اجازت سے کلیر شریف میں اللہ کے بتائے ہوئے دین و تعلیم کو سمجھانے کا کام شروع کر دیا۔

**آپ کی زندگی کا آخری دور:** صابر پیا نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے خلیفہ شمس الدین سے کہا کہ شمس الدین تم مجھے قبر میں مت اتارنا ۱۵۰۲ء میں میرے ہی سلسلہ میں ایک مجدد پیدا ہوگا جو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے ہوگا، یہ قطب عالم شاہ عبدالقدوس گنگوہی کی طرف اشارہ تھا وہ دوبارہ آکر میری نماز جنازہ پڑھے گا اور وہی مجھے قبر میں اتارے گا، وہ مجدد اور اس کی اولاد میرے ظاہر و باطن کی وارث ہوگی۔ حضرت شمس الدین یہ باتیں سن کر رونے لگے تو حضرت صابر پیا نے بہت پیار کے ساتھ ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ یہی اللہ کی مرضی ہے۔ اور حضرت صابر پیا گلیر کی ٹہنی پکڑ کر کھڑے ہوگئے اور آپ کو استغراق ہوگیا یعنی خدا کی عبادت میں مشغول ہوگئے۔ (جاری)

# پھل اور سبزیاں، غذا بھی دوا بھی

از: ڈاکٹر نعمان باشاہ قریشی، بی یو ایم ایس
ایم اے، ادیب فاضل مدراس یونیورسٹی
Cell : 9994616223

انسان کی زندگی میں سب سے بڑی اور انمول نعمت صحت اور تندرستی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی سے صحت رخصت ہو جائے اور وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جائے تو اسکی زندگی سے راحت وسکون اور کیف وسرور ختم ہو جاتا ہے، اور دیر پا مہلک بیماریوں پر مبنی زندگی نہ صرف میرض کے لئے وبال جان بن جاتی ہے بلکہ اس کے سارے متعلقین کے لئے دائمی تکلیف اور عدم سکون کا باعث بن جاتی ہے۔ صحت کے ساتھ مرض اور بیماری کے بعد صحت یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کے لئے یہ تاکید فرمائی ہے کہ وہ صحت اور تندرستی کے دنوں کی قدر کرے اور اپنے تعمیری وترقی کے منصوبوں کو مکمل کرنے اور اپنی آخرت کی تعمیر کر لے، کیونکہ تندرستی چلی گئی تو آدمی معطل اور بے سود ہو جاتا ہے۔ بیماری آنے سے پہلے صحت کو غنیمت جانو، غنیمت کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسے اعمال اور افعال سے دور ہو جن کی وجہ سے صحت متاثر ہو جاتی ہے اور کوئی بھی مرض لاحق ہوسکتا ہے۔ اسی میں یہ پہلو بھی شامل ہے کہ آدمی اپنے کھانے پینے میں ایسی چیزوں کو استعمال کرے جو اسکی صحت کو برقرار رکھ سکتے ہوں، اور وہی اشیاء کھائے جو اسکے معدے کے موافق رہتی ہوں، اور خورد ونوش میں وہ چیزیں شامل نہ کریں جو اسے بیماری میں مبتلا کرسکتی ہیں۔ اکثر لوگ بیمار ہونے کے کئی اسباب ہوتے ہیں، ان میں سے ایک سبب یہ رہتا ہے کہ وہ غذاؤں میں موجود مفید اور غیر مفید اجزاء اور اثرات کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور اپنے کھانے پینے میں پرہیز نہیں کرتے۔ اور زیادہ تر تفیلا ور دیر ہضم غذائیں مسلسل کھاتے ہی رہتے ہیں جس کی وجہ سے نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے اور جگر کا فعل متاثر اور خراب ہو جاتا ہے۔ نظام ہضم کی خرابی ساری بیماری کی جڑ ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کو اس کے دین کے علم کے ساتھ اس کے بدن کے علم کو جاننا نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

پھل اور سبزیاں غذا بھی ہیں اور دوا بھی ان کے استعمال سے آدمی مختلف اور معتدد بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے اور صحت مند بھی رہتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنے روزمرہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں سبزیوں اور پھلوں کو ضرور شامل رکھنا چاہئے۔ موجودہ وقت میں ڈاکٹروں نے ذیابطیس کے مریضوں کو بھی بعض مخصوص پھلوں کو محدود پیمانے پر استعمال کرنے کو ضروری قرار دیا ہے اور سبزیوں کو بھی ان کی روزانہ غذا کا ایک لازمی جز قرار دے دیا ہے اور ان کا کھانا کسی وقت کا بھی ہو سبزیاں ایک جز لاینفک قرار دی گئی ہیں۔

قرآن کی رو سے آدمی کی عمر متعین ہے اور وہ مقررہ وقت ہی میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور اس وقت مقررہ میں ایک لمحہ کی کمی بھی نہیں ہو سکتی اور ایک لمحہ کی زیادتی بھی ہو نہیں سکتی۔ اگر آدمی اپنی غذاؤں میں سبزیوں اور پھلوں کو شامل کر لے اور کھانے پینے میں احتیاط اور اعتدال رکھے تو وہ اپنی مقررہ زندگی صحت و تندرستی کے ساتھ مکمل کر سکتا ہے۔ حکماء ایسی صحت والی زندگی کو عمر کی درازی سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ بیماری کے ساتھ زندگی حقیقت میں زندگی نما موت ہے۔ سبزیاں ہوں یا پھل ہوں یا اور کوئی بھی غذائیں ہوں، آدمی کی عمر میں اضافہ نہیں کر سکتیں۔

احمد ٹائمز حیدر آباد ستمبر ۲۰۱۷ء میں پھل اور سبزیوں سے متعلق یہ معلومات بیان کی گئی ہیں۔ ماہرین کے مطابق روزانہ سات یا اس سے زائد پورشن پھلوں اور سبزیوں کے استعمال سے کینسر اور دل کے عارضے کی وجہ سے واقع ہونے والی اموات کے امکان میں کافی حد تک کمی واقع ہو سکتی ہے اور اس سے عمر میں بھی صحت بخش طور پر اضافہ ہوتا ہے۔

پھلوں کے جوس کی بہ نسبت پھلوں میں زیادہ فائدہ بخش اثرات پائے جاتے ہیں، چونکہ ان میں اینٹی آکسیڈنٹس موجود ہوتے ہیں جو مردہ خلیوں کی مرمت کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ جبکہ جوس کی شوگری سیرپ میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس جائزہ کی اہم اور نگراں کار محقق ڈاکٹر اوٹینلو ڈے کا کہنا ہے کہ یہ ایک واضح پیغام ہے جس میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سبزیاں اور پھل کھانے کا مشورہ دیا گیا ہے تا کہ لوگ اپنی کسی بھی خاص عمر میں فوت ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔

معتدد سائنسی جائزوں سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ جو لوگ زیادہ پھل اور سبزیاں استعمال کرتے ہیں ان میں امراض قلب اور بعض اقسام کے کینسر کا خطرہ بہت کم ہوتا ہے۔ اگر آپ مختلف اقسام کے پھل اور سبزیاں کھا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جسم کو جن وٹامنز اور منرلز (معدنیات) کی ضرورت ہے وہ انہیں مل رہی ہیں۔

# مشہور صحابی رسول حضرت حکیم ابن حزام رضی اللہ عنہ کی شخصیت

مولانا قاری امتیاز احمد رشادی قاسمی
مہتمم مدرسہ رشیدیہ ویلور

میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا آپؐ نے عطا فرمایا پھر مانگا پھر دیا پھر مانگا پھر عنایت فرمایا، پھر ارشاد فرمایا:

اے حکیمؓ! یہ مال بظاہر (دل کو لبھانے والی) سرسبز وشیرینی ہے لیکن جس نے دل کے استغنا کے ساتھ حاصل کیا اس میں برکت ہوتی ہے، جس نے خواہش نفس کے ساتھ لیا اس میں برکت نہیں ہوتی اور وہ اس طرح ہے جو کھائے اور سیر نہ ہو، یاد رکھو، اوپر کا (دینے والا) ہاتھ نیچے کے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مشہور اور جلیل القدر صحابی حضرت حکیم ابن حزامؓ کا اپنا واقعہ ہے جو اوپر نقل کیا گیا ہے اور کم وبیش انہی الفاظ کے ساتھ بیشتر حدیث کی کتابوں میں خود ان کی زبانی منقول ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت حضرت حکیم ابن حزامؓ کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئی انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ آئندہ نہ میں کبھی آپؐ سے کچھ مانگوں گا اور نہ کسی اور سے کچھ لوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے اس عہد کو اس شدت کے ساتھ پورا کیا کہ تادم مرگ انہوں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا اور نہ کسی سے کچھ لیا، حضورؐ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کو وظیفہ دینے کے لئے بلاتے رہے مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ سربراہ خلافت ہوئے تو انہوں نے بھی بار بار حضرت حکیمؓ کو عطیہ دینا چاہا لیکن وہ برابر اس کے لینے سے انکار کرتے رہے آخر ایک دن حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مخاطب ہوکر (اظہار براءت کے لئے) فرمایا: مسلمانو! گواہ رہنا کہ میں حکیمؓ کو ان کا حق (وظیفہ) دینے کے لئے بلاتا ہوں مگر وہ قبول نہیں کرتے۔ (صحیح بخاری، حدیث: ۱۴۷۲)

حضرت حکیمؓ کا یہ واقعہ کب پیش آیا اور اس کا پس منظر کیا ہے پیش کرنے سے قبل آپ کے حالاتِ زندگی ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ واقعہ کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

**سلسلۂ نسب** حضرت حکیم بن حزامؓ کا نسبی سلسلہ عرب کے مشہور خاندان قریش سے جڑا ہوا ہے اور اس کی ایک معزز شاخ بنو اسد سے آپ کا تعلق ہے جو آپ کے جد امجد اسد ابن عبدالعزی کی طرف منسوب ہے، عشرہ مبشرہ میں سے مشہور صحابی حضرت زبیر ابن عوامؓ آپ کے چچازاد بھائی اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ آپ کی پھوپی ہوتی ہیں۔ ام المؤمنین سے اسی نسبت کے سبب خاندان نبویؐ سے بھی آپ کا رشتہ مربوط ہوجاتا ہے اس کے علاوہ پانچویں پشت میں قصی بن کلاب پر ان کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے نام ونسب اس طرح ہے:

حکیم بن حزام ابن خویلد ابن اسد ابن عبدالعزی ابن قصی القرشی اسدی۔ آپ کے فرزند خالد کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوخالد ہوتی ہے۔ والدہ کا نام فاختہ بنت زبیر بن حارث ابن اسد بن عبدالعزی ہے۔

**اخلاق وعادات** حکیم بن حزامؓ شروع ہی سے نیک مزاج، حلیم الطبع، صلہ رحمی کرنے والے اور متقی صفت انسان تھے، خاندانی شرافت، عزت ووجاہت کے مالک اور ذی مرتبت سمجھے جاتے تھے، بڑے دانا، مدبر اور صاحب رائے شمار کئے جاتے تھے۔ قریش کی مشورہ گاہ ''دارالندوہ'' جوان کے لئے پارلیمنٹ یا عدالت کے قائم مقام تھی چالیس برس سے کم عمر کا کوئی فرد اس میں داخل ہونے اور اس کا رکن بننے کا اہل نہ ہوتا تھا مگر پندرہ برس کی کم عمری کے باوجود حضرت حکیم بن حزامؓ کی بصیرت ودانائی اور فہم وفراست کی وجہ سے انھیں وہاں

داخلہ کی خصوصی اجازت حاصل تھی بلکہ ہر موقع پر وہ شریک مجلس رہتے تھے۔

اچھے اور کامیاب تاجر تھے، سال کے دونوں موسم میں بغرض تجارت ملک یمن اور شام کا سفر کرتے تھے، قسمت نے بھی یاوری کی تھی، کامیاب اور بامراد واپس ہوتے اور ہمیشہ مالا مال رہتے، کبھی خسارہ نہ ہوتا، اسی لئے قریش کے صاحب ثروت شرفا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت کریم النفس تھے، خویش واقارب اور دوسرے حاجتمندوں کی امداد پر ہروقت کمربستہ رہتے تھے، سخاوت وفیاضی عام ہوتی تھی، بیک وقت ایک مرتبہ سواونٹ صدقہ اور سو غلام آزاد کئے تھے، حجاج کرام کی مہمان نوازی میں بھی آگے رہتے، اپنی دولت کا ایک حصہ اس کے لئے مختص کردیئے تھے اس کے علاوہ نیکی اور بھلائی کے دوسرے کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔

**قبل از اسلام** اسلام قبول کرنے میں حضرت حکیم بن حزام اگرچہ مؤخر ہے لیکن نہ مسلمانوں سے کوئی کدورت رکھتے تھے نہ ان سے کچھ تعرض کرتے بلکہ اپنے سابقہ تعلقات کو استوار رکھے ہوئے تھے، مشرکین قریش مسلمانوں کو ستانے کے لئے جو حرکتیں کرتے تھے آپ ان سے باز رہتے تھے، اور جب کبھی موقع ملا مظلوم اہل حق سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ اپنی پھوپی حضرت خدیجہؓ سے بے پناہ محبت تھی، اسلام آنے کے بعد ان سے قائم ربط وضبط میں کوئی کسر نہ آنے دی اور اس رشتۂ الفت ومحبت کو برقرار رکھا تھا۔

بعثت نبویؐ کے ساتویں سال جب مشرکین قریش نے مسلمانوں اور بنی ہاشم سے مقاطعہ کرلیا اس دوران بھی اپنی پھوپی اور مظلوموں کی اعانت میں کوشاں رہے، ملک شام کی طرف سے آنے والے قافلوں سے خاموشی کے ساتھ سامان خرید کر اپنی پھوپی حضرت خدیجہؓ اور آپ کے پورے قبیلے والوں میں تقسیم کردیتے تھے، اسی طرح متعدد بار رات کے اندھیرے میں قریش سے چوری چھپے کچھ غلہ محصورین کے پاس روانہ کئے۔ ایک مرتبہ ابوجہل نے دیکھ لیا تو راستہ روک کر کھڑا ہوگیا، ادھر یہ بھی قریشی تھے بات بڑھ گئی یہ مصر تھے کہ میں اپنی پھوپی تک غلہ ضرور پہنچاؤں گا اور ابوجہل بضد تھا کہ میں یہ غلہ جانے نہیں دوں گا اس دوران ابوالبختری بن ہشام جو کہ ایک نیک دل رئیس تھا سامنے آگیا اس نے مداخلت کی اور ابوجہل کو سخت سست کہا جس کے نتیجہ میں یہ غلہ پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

**آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت حکیم بن حزام کا تعلق** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت ان کی عمر تیرہ برس کی تھی، گردوبیش کے احوال کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے، خود فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے اپنی نذر ومنت کی بنا پر آپؐ کے والد عبداللہ کو قربانی کرنا چاہا تو میں اس وقت سمجھ بوجھ رکھنے والا بچہ تھا، یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے پانچ سال پہلے کا ہے پس آپ کی ولادت طفولیت جوانی کے واقعات اور آپ کی صدق ودیانت داری ان سے کیسے مخفی رہے گی۔

حضرت خدیجہؓ کی نسبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حکیم بن حزام کے پھوپا تھے وہ آپ کو بہت عزیز جانتے تھے اور آپ کے ساتھ نہایت تکریم کا برتاؤ کرتے تھے، آپؐ کے دعوی نبوت کی وجہ سے اپنی عقیدت میں کچھ آنچ آنے نہ دیا۔

ایک مرتبہ سفر میں ان کو یمن کے ایک سابق حمیری بادشاہ کا شاہی لباس بکتا ہوا نظر آیا انہوں نے پچاس دینار میں وہ قیمتی لباس خرید لیا جس کو وہ آنحضرت کے لئے ہدیہ کرنا چاہتے تھے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت ہجرت کرکے مدینۂ طیبہ تشریف لے جاچکے تھے وہ اس کو لے کر وہیں پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، چونکہ یہ ابھی شرک کے دلدل سے نہیں نکلے تھے آپ نے اس کے قبول کرنے میں تردد وتامل کیا قیمتاً خرید کر ان کی دلجوئی کے لئے آپ نے وہ لباس زیب تن فرمایا حضرت حکیمؓ کہتے ہیں میں آپؐ کو اس لباس میں اور زیادہ خوبصورت پایا۔

**حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کا اسلام** قدرت کے رنگ بھی عجیب ہیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت حق کا آغاز فرمایا تو بعض ایسے لوگ جو بہت سخت دل اور تندمزاج تھے لپک کر آگے بڑھے اور لوائے توحید کو تھام کر السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ کی مقدس جماعت میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرلیا، لیکن بعض ایسے لوگ جو بڑے شریف، نرم خو، بہادر، فیاض، اور ہمدرد خلائق تھے اپنے آبائی مذہب پر سختی سے قائم رہے اور قبول ایمان میں سبقت سے محروم رہ گئے، حضرت ابوخالدؓ حکیم ابن حزامؓ ایسے ہی لوگوں میں تھے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت ۵۳ رسال کو پہنچ چکے تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت محبوب رکھتے تھے لیکن افسوس کہ جب آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش

کیا تو انہوں نے اس کے قبول کرنے میں عذر کیا، اور اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ کفر وشرک کی بھول بھلیوں میں ان کو بھٹکتے دیکھ کر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آزردہ ہوتے تھے، مگر وہ اسی روش پر قائم رہے تھے۔

فتح مکہ کے موقع پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کے قریب ''مرالظہر ان'' مقام تک پہنچے تو آپ نے بعض صحابہؓ (ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس) سے فرمایا: مجھے حکیم ابن حزام کا شرک میں مبتلا رہنا سخت ناگوار ہے میری خواہش ہے کہ وہ مسلمان ہوجائیں (آپ نے ان کے ساتھ عتاب ابن اسید، جبیر ابن مطعم، اور سہیل بن عمرو کے نام بھی لیا)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی خواہش پوری کردی آپ ابھی مرالظہر ان سے آگے نہیں بڑھے تھے کہ حکیم کے دل سے کفر وشرک کا زنگ دور ہوگیا وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر شرف اسلام سے بہرہ ور ہوگئے۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا شاید یہ ندامت کے آنسو تھے یا اسلام لانے کی خوشی کے، اس موقع پر رحمت عالمؐ نے کمال شفقت اور محبت سے ان کا ہاتھ اپنے دست مبارک سے پکڑ لیا۔

نیز آپ نے ان کی عزت افزائی کے طور پر یہ بھی اعلان فرمایا کہ: مَنْ دَخَلَ دَارَ حَكِيمِ ابنَ حِزَامٍ فَهُوَ اٰمِنٌ کہ جو شخص حکیم ابن حزام کے گھر میں داخل ہوجائے اس کو امان ہے جیسے یہ اعزاز آپ نے حضرت ابوسفیانؓ کو بخشا تھا۔ (السیر، ذہبی)

**قبول اسلام کے بعد** اسلام قبول کیا تو آپ نے اس کا حق بھی خوب ادا کیا عمر ۷۴ ر چوہتر برس کی تھی اور بوڑھے ہوچکے تھے لیکن فتح مکہ سے متصل پیش آنے والی غزوۂ حنین میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ ایک مرتبہ حج کیا تو ان کے ہمراہ سو اونٹ تھے جن پر جرہ (یمن کے ایک قیمتی کپڑے) کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں، ان سب اونٹوں کو انہوں نے ہدی بنایا (یعنی ان کی قربانی کی) جب عرفہ میں انہوں نے وقوف کیا تو ان کے ساتھ سو غلام تھے جن کی گردنوں میں چاندی کی تختیاں لٹکی ہوئی تھیں اور ان پر یہ الفاظ درج تھے :عتقاء اللہ عن حکیم بن حزام یعنی خدا کے لئے آزاد کئے گئے ہیں حکیم بن حزام کی طرف سے۔

ایک روایت میں ہے کہ جس غلام کو حضرت حکیم نے آزاد کیا اس کو ایک اونٹ بھی عطا کیا، اس کے علاوہ انہوں نے ایک ہزار بکریوں کی قربانی بھی کی۔

جب ان کے چچازاد بھائی حضرت زبیرؓ کا ۳۵ھ میں انتقال ہوا تو تقریباً بائیس لاکھ مقروض تھے، حضرت حکیمؓ نے ان کے فرزند عبداللہ ابن زبیر سے کہا اگر ضرورت محسوس کریں تو مجھ سے مدد لے لینا لیکن اس کی نوبت نہ آئی ان کی جائیداد سے ادائیگی کا انتظام ہوچکا۔

حضرت حکیمؓ اپنے تاخیر سے اسلام لانے پر بہت افسوس کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں بدر، احد، خندق اور دوسرے غزوات میں شرکت کی سعادت سے محروم رہا، دوسرے لوگ خوش قسمت تھے کہ مجھ پر بازی لے گئے کوئی غازی بنا اور کوئی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوا لیکن میں پیچھے رہ گیا۔

آپ فرماتے تھے قریش کے بڑے سرداران جو اپنے کفر پر قائم تھے ان کی اقتدا میں میں قبول حق سے محروم رہا، اے کاش: میں ان کی اقتدا نہ کرتا۔

ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ تاخیر فی الاسلام سے جو خسارہ ہوا اس کی تلافی ہوجائے اور یہ آرزو رہتی تھی کہ اسلام سے قبل کئے گئے اعمال خیر بارگاہ خداوندی میں درجۂ قبولیت حاصل کرلے۔ ایک مرتبہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ دور جاہلیت میں جو اچھے کام کرتا تھا کیا ان پر اجر وثواب ملیں گے آپ نے ارشاد فرمایا: اَسْلَمْتَ عَلٰی مَاقَدْاَسْلَفْتَ مِنَ الْخَیْرِ اپنے سابقہ بھلائیوں کی وجہ سے تو تم اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ (چونکہ آپ نے قبولیت کی تصریح نہ کی اس لئے شاید انھیں اطمینان نہ ہوا ہو) حضرت حکیمؓ نے کہا: خدا کی قسم جو نیک اعمال میں نے جاہلیت میں کئے تھے ایسے ہی اسلام میں بھی کروں گا۔ چنانچہ آپ نے پھر سو غلام آزاد کئے اور سو اونٹ صدقہ کئے۔

بدر واحد میں قریش مکہ کے ساتھ بادل ناخواستہ شریک ہوئے تھے اس کے بعد انہوں نے عہد کرلیا کہ اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ نہیں کروں گا۔ اسی بدر کی جنگ میں حضرت حمزہؓ کے مکمل نشانہ پر آگئے تھے مگر قتل ہوتے ہوتے بچ کر بھاگ نکلے اسلام

لانے کے بعد اس کو یاد کر کے خوش ہوتے۔ اس لئے نہیں کہ جان بچ گئی بلکہ کفر کی موت اور جہنم کی آگ سے نجات پا کر مذہب اسلام اور شرف صحابیت سے بہرہ ور ہوئے۔ اور جب کوئی بڑی قسم کھاتے تو کہتے: وَالَّذِی نَجَانِیْ یَوْمَ بَدْرٍ، اس ذات کی قسم جس نے مجھے بدر کے دن نجات دی۔

دارالندوہ (قریش کی مشورہ گاہ) جو زمانہ جاہلیت سے حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت تک انھیں کے تصرف میں تھا ایک لاکھ (یا چالیس ہزار) درہم میں حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا، ان کے بھتیجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو یہ سودا ناگوار گذرا انہوں نے حضرت حکیم سے کہا آپ نے قریش کی قابل فخر عمارت بیچ دی تو کہنے لگے: اِبن اَخِیْ ذَھَبَتِ الْمَکَارِمُ فَلاکَرَمَ اِلَّا التَّقْوِیْ اسلام کے بعد اب پرہیزگاری کے سوا کوئی چیز قابل فخر نہیں رہی پھر فرمایا: اے بھتیجے میں نے یہ مکان شراب کے ایک مشکیزہ کے بدلے خریدا تھا اب میں اس کے بدلے جنت میں گھر خریدوں گا۔ پھر اس پوری رقم کو اللہ کی راہ میں دے دیا۔ (ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ کے قتل (نعوذ باللہ) کا مشورہ اسی مکان میں ہوا تھا حضرت حکیم بھی اس مجلس کے شریک رہے تھے شاید انھیں اس شرکت کا ملال اور احساس ہوتا رہا، اور اس کو فروخت کرنے میں انھیں تسکین ہوئی۔)

عہد رسالت میں ان کا زمانۂ اسلام صرف تین برس کا ہے تاہم اس مختصر عرصے میں وہ فیضان نبوی سے مقدور بھر بہرہ یاب ہوئے
۔

اسلام لانے کے بعد انہوں نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی اور وہیں کے ہو کر رہ گئے چاروں خلفاء کا عہد دیکھا حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ان کے دفاع میں پیش پیش رہے انہوں نے ان کے گھر پر پہرا دیا اور باغیوں کو پوری جرأت سے روکا جب سیدنا عثمانؓ کی شہادت ہوگئی تو یہ سخت فتنے کا وقت تھا، مدینہ پر عملاً باغیوں کا قبضہ تھا، کبرسنی کے باوجود اس مشکل دور میں انہوں نے عزیمت سے کام لیا جن افراد نے رات کے اندھیرے میں سیدنا عثمانؓ کو جنت البقیع میں دفن کیا اور ان کی نماز جنازہ پڑھی، ان میں سیدنا حکیم ابن حزامؓ بھی شامل تھے۔

**وفات** حضرت حکیمؓ ۵۴ھ میں خلافت حضرت معاویہ کے دسویں سال بعمر ۱۲۰ رسال" بلاط الفاکہہ" میں وفات پائی اِنَّاللہِ وَاِنَّاالیہ راجِعُونْ۔ آخری عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی، وفات کے وقت آپ کی زبان پر لآالہ الااللہ کے کلمات جاری تھے اور فرماتے تھے: قدکنت اخشاک واناالیوم ارجوک کہ یااللہ میں تجھ سے ڈرتا تھا لیکن آج مجھے تجھ سے حسن انجام کی امید ہے۔

تمام اہل سیر نے یہ اتفاق کی بات لکھی ہے کہ آپ نے نصف عمر جاہلیت (کفر) میں اور نصف عمر بحالت اسلام میں بسر کی مگر یہ حساب تغلیباً ہے ورنہ قبول اسلام کے وقت ان کی عمر چوہتر ۷۴ ربرس کی تھی جیسا کے ابن اسیر نے اس کی نشاندہی کی ہے۔

**حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کی ایک منفرد خصوصیت:** حضرت حکیمؓ کی ایک منفرد پہچان اور خصوصی شناخت ایسی ہے جس سے دوسرا کوئی متصف نہیں اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں اور وہ کعبۃ اللہ کے اندر ان کا تولد ہونا، قصہ اس طرح ہے کہ ان کی والدہ بحالت حمل جبکہ وقت ولادت قریب تھا چند عورتوں کے ساتھ حصول برکت کی نیت سے کعبۃ اللہ میں داخل ہوئیں کہ اچانک وہیں دردزہ شروع ہوگیا: اتنا موقع نہ تھا کہ وہاں سے نکل جائیں فوراً ایک چمڑا مہیا کیا گیا جس پر حضرت حکیمؓ کی ولادت ہوئی اور مَوْلدَ الْکَعْبَۃ (کعبۃ اللہ میں پیدا ہونے والے) سے مشہور ہوئے۔ آپ کی پیدائش واقعہ فیل سے تیرہ سال پہلے کا ہے۔

**حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کا ایک غیر شعوری کارنامہ** غلاموں کو آزاد کرنے میں حضرت حکیمؓ کی فیاضی مشہور تھی سینکڑوں غلاموں کو آزادی دے کر انھیں اپنی مرضی کے مالک بنا دیتے تھے اور تادم آخر یہ سلسلہ جاری تھا، لیکن ایک غلام کو انہوں نے آزادی نہیں دی تھی بلکہ اپنی ہی ملکیت بنائے رکھے تھے، نہیں معلوم کہ ارادۃً ایسا کیا یا ایسے ہی غلامی میں رکھے رہے۔

دراصل یہ غلام نہیں بلکہ اپنے آزاد والدین کا ایک محبوب نوجوان بیٹا تھا جس کو بنوقین کے ڈاکوؤں نے یمن سے اغوا کر کے مکہ کے مشہور بازار عکاظ میں غلام بتا کر کے فروخت کے لئے لے آئے تھے حضرت حکیم نے دیکھا تو چار یا چھ سو درہم میں خرید لیا۔ اس نوجوان

میں غلامی کے بجائے تہذیب اور خاندانی شرافت کے آثار محسوس کئے تو اپنے ہی پاس رکھنا پسند کیا۔

کچھ عرصہ بعد اپنی پھوپی حضرت خدیجہؓ کی نذر کر کے ان کو مالک بنا دیا تھا، ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ جنھوں نے اپنا سارا مال اسلام کی راہ میں آنحضرت ﷺ کی نذر کر دیا تھا اس نوجوان کو بھی رسول اللہ ﷺ کے لئے ہدیۃً پیش کر دیا۔

یہ کون بخت آور جان پدر تھا جسے آقائے دوجہاں ﷺ کی شفقت ملی، جسے اپنے کھوئے ہوئے والدین سے زیادہ آپؐ سے پیار اور ممتا حاصل رہی؟! یہ خوش قسمت لخت جگر حضرت زید بن حارثہؓ تھے جو آنحضرت ﷺ کے محبوب (حِب النبی) صحابی اور اسلام کے اولین چارنفری مبارک قافلہ کے ایک فرد سعید تھے، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے حبیب پاک کے اس محبوب خاص کے نام نامی کو قرآن مجید میں ذکر کر کے جہاں آنحضرت ﷺ کی مسرت کا سامان فرمایا وہیں ان کی فضیلت کو بھی بام عروج پر پہنچایا۔

اس عالی مرتبت بلند اقبال اور رشک خلائق وملائک کے خریدار حضرت حکیمؓ کو لاشعوری میں بھی یہ خیال نہ رہا ہوگا کہ اپنا یہ معصوم ،فضیلت وسعادت کی سرحدوں کو چھونے والا ہے اور ایک ذات اقدس سے اس کو آزادی کا پروانہ بلکہ بے نظیر شفقت حاصل ہونے والی ہے۔

حضرت حکیم نے حضرت زید کو آزاد کیا تھا مگر جس ذات اقدس کی خدمت میں پہنچا دیا تھا اس کی غلامی پر ہزاروں آزادیاں قربان کی جاسکتی ہیں اور سینکڑوں غلاموں کے آزاد کرنے کی جو فضیلتیں حضرت حکیمؓ کو حاصل رہی ہیں ان سب پر یہ نسبتیں بازی لے جاسکتی ہیں، یقیناً حضرت حکیمؓ سبقت فی الاسلام کے شرف سے محروم رہے مگر حضرت زیدؓ کے تفضّل میں بالواسطہ جوان کی شرکت رہی اس سے وہ اپنی تاخیر اسلام کی تلافی کے امیدوار بھی رہے ہوں گے، مگر افسوس کہ حضرت حکیمؓ بحالت اسلام اپنے اس متاع گرانمایہ کی زیارت نہ کر پائے تھے کہ جنگ موتہ میں وہ جام شہادت نوش فرما کر اپنے آقائے حقیقی اور مالک کل سے جا ملے۔ فَرِضِيَ اللّٰهُ عَنْهمَا وَأَرْضَاهُمَا۔

**مقصود نگارش** حضرت حکیمؓ ابن حزام کی مذکورہ بالا مفصل حالات زندگی کے تذکرہ سے ان صفحات کو مزین کرنے کا مقصود اصلی اس خلجان کو دور کرنا ہے جو ایک طرف اسلام نہ لانے کے باوجود شعب ابی طالب میں محصور مسلمانوں کے لئے غلہ واناج بھیجنے والے رحم دل اور فیاض صفت انسان اور دوسری طرف دربار رسالت میں اپنی حاجت اور ضرورت پیش کرنے والے ضرورت مند سائل اور حاجتمند مسلمان کی متضاد حیثیت والی شخصیت کے طور پر متعارف ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

آپ کی زندگی کے جو روشن پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں سب سے نمایاں وصف ان کا جود وسخا ہے جو کسی بھی موقع پر ان سے منقطع نہیں ہوا، چاہے آپ کی بعثت سے قبل ہو، یا اعلان نبوت کے بعد ان کے قبول اسلام سے پہلے یا اسلام لانے کے بعد ہو، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ صاحب ثروت اور آسودہ حال شخص رہے ہیں بلکہ بے دریغ لٹانے والے مستغنی قسم کے صاحب خیر رہے ہیں، ایسے میں آنحضرت ﷺ سے ان کا مانگنا اور دوسری یا تیسری مرتبہ پر حضور ﷺ کا ان کو تنبیہ کرنا یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہے اور وہ کونسے حالات تھے جن کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوئی کہ کیا یہ دو الگ شخصیتیں ہیں یا متفرق مواقع میں ایک ہی شخصیت کے دو واقعے ہیں۔

مندرجہ ذیل مشمولات میں اسی اشکال کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کی مہم سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ ثقیف وہوازن کے دونوں قبیلے چند اور قبیلوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے خیمہ زن ہوگئے، بے حساب آلات حرب اور خوب جنگی سامانوں کے ساتھ مال مویشی اور بال بچے بھی ساتھ لائے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مدینے سے آئے ہوئے دس ہزار صحابہؓ اور اسلام قبول کئے ہوئے اہل مکہ کے دو ہزار صحابہ کے ساتھ آپ نے مقابلہ کیا۔ دشمنوں کو ہزیمت ہوئی اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا اہل سیر کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا مال غنیمت بلکہ اس کا نصف وربع بھی شاید نہیں ملا ہو، جس کی تفصیل یہ ہے: اونٹ: چوبیس ۲۴ ر ہزار، بکریاں: چوبیس ۲۴ ر ہزار، چاندی: چار ہزار اوقیہ (تقریباً چھ سو کلو) اور قیدی چھ ہزار تھے۔ (اصح السیر)

آپ نے جب مال غنیمت تقسیم فرمایا تو تالیف قلب (اسلام میں نئے داخل ہونے والے مسلمانوں کی دلجوئی) کے طور پر چند اشراف قریش کو مال غنیمت کا وافر حصہ عنایت کیا حضرت ابوسفیانؓ کو چالیس اوقیہ چاندی اور سو اونٹ عطا فرمائے انہوں نے دومرتبہ مزید درخواست کی تو ہر مرتبہ اسی قدر عنایت کئے۔ اسی طرح حضرت نضر ابن الحارث، علاء ابن حارثہ، صفوان ابن امیہ اور عباس بن مرداس کو سو سو اونٹ مرحمت فرمائے۔

حضرت حکیم ابن حزامؓ بھی اس موقع پر حاضر بارگاہ تھے سرور عالم ﷺ نے انھیں بھی سو اونٹ عنایت فرمائے، انہوں نے مزید مانگا آپؐ نے عطا فرمایا پھر درخواست کی تو رسول اللہ ﷺ نے پھر مرحمت فرمائی۔

ابتدائے مضمون میں جس واقعہ کا تذکرہ کیا گیا وہ عین یہی واقعہ ہے جو غزوہ حنین کے مال غنیمت کی اس تقسیم کے موقع پر پیش آیا، روایت میں اختصار کی وجہ سے سوال کی حیثیت واضح نہ ہوسکی ہے۔

اصل یہ کہ حضرت حکیمؓ خود دست عطا رکھتے تھے، ان کی غیرت کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے یا حاجتمندانہ حاضر ہونے کو کیسے گوارا کرے گی، یہاں انہوں نے ابتداء مانگ نہیں کی جیسے کہ الفاظ حدیث سے مفہوم ہوتا ہے بلکہ رحمت عالم ﷺ نے اولاً خود مرحمت فرمائی تو انھیں محسوس ہوا کہ سرور کونین کا دربار عطا سجا ہوا ہے اور گویا "ہے کوئی سائل" کی صدا لگ رہی ہے۔ اس ابر کرم کے موقع پر استغنائیت یا بے طلبی کا مظاہرہ بدقسمتی اور محرومی سے خالی نہ ہوگا اس لئے مانگ لیا بار بار مانگ لیا ادھر سے عطا بھی ویسے ہی رہی ہر بار کامل و مکمل سو سو اونٹ کی بخشش!

لیکن چونکہ حضرت ابوسفیانؓ، حضرت حکیمؓ اور بہت سے دیگر اصحاب آپ سے مانگتے رہے اور سرور عالم ﷺ عنایت فرماتے رہے، اس منظر سے یہ واہمہ ہوسکتا تھا کہ شاید مانگنے اور سوال کرنے میں کوئی قباحت ہی نہیں۔ اس ممکنہ خیال کو دور کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ کسی بھی سوال میں جب اشراف نفس (حرص) شامل ہوجاتا ہے تو اس سے برکت اٹھالی جاتی ہے۔ اس سے آپ نے نفس مسئلہ کا ایک حکم واضح فرمایا نہ کہ وہاں موجود کسی فرد بشر پر نکیر فرمائی۔ بلکہ مصنف عبدالرزاق کی ایک دوسری روایت جس میں مذکور ہے کہ حضرت حکیمؓ نے مانگنے کے بعد خود ہی آنحضرت ﷺ سے پوچھ لیا کہ یارسول اللہ: اَیُّ عَطِیَتِکَ خَیرٌ؟ قَالَ الاُوْلیٰ: آپ کا کونسا عطیہ (پہلا جو آپ نے خود عنایت فرمایا یا دوسرا جو میرے مانگنے پر ملا) بہتر ہے تو آپ نے فرمایا پہلا!!! اب کوئی اشکال ہی نہیں رہ جاتا ہے۔ (مصنف عبدالرزاق رحیاۃ الصحابہ، جلد سوم)

یا صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حضرت حکیمؓ کی عالی حوصلگی کے پیش نظر انھیں یہ خصوصی وصیت فرمائی کہ ایسی صورت حال آپ کی شایان شان نہ تھی۔

نیز چونکہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ سوال کی حقیقت واضح فرمائی بلکہ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: اَلْیدُ الْعُلیا خَیرٌ مِنْ یَدِ السُّفْلیٰ۔ یعنی اوپر کا (دینے والا) ہاتھ نیچے کے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ اس کا مزید اثر یہ ہوا کہ اشراف نفس کے ساتھ سوال تو برا ہے ہی، بغیر اشراف کے مانگنا بھی ناپسند، بلکہ کسی سے بے طلب ملنے والا عطیہ حاصل کرکے ید سفلی والوں میں شامل ہونا بھی انھیں گوارہ نہ رہا، اس لئے دوجہاں کے آقا ﷺ کی اس وصیت کو حرز جان بنائے ہوئے رہے اور تادم زیست اس پر قائم رہ کر اپنی آخرت سدھار گئے۔

خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ حکیم ابن حزامؓ کے نام سے جماعت صحابہ میں ایک ہی شخصیت کا وجود مسعود ہے، سائل اور صاحب خیر کوئی دوجدا اشخاص نہیں ہیں۔ نیز موقع سوال بھی ایک ہی وقت کا ہے، کسی زمانے کے دو متفرق واقعے نہیں ہیں یعنی سخاوت وفیاضی کے پیکر بھی وہی اور دربار اقدس سے طلب کرنے والے بھی یہی عظیم شخصیت ہیں: لیکن حضرت حکیمؓ کا سوال حاجت وضرورت کے طور پر نہیں حصول فیض وبرکت کے لئے ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ان کو یا کسی کو زجراً و توبیخاً نہیں بلکہ توضیحاً واحتیاطاً ہے۔ اور اگر خود حضرت حکیمؓ کے استفسار پر آپ نے ارشاد فرمایا ہو تو ان کے پیش کردہ اشکال کو دور کرنا ہے، نہ کہ کسی پر تنبیہ!!! **واللہ تعالی اعلم وعلمہ اتم۔**

# جذب وسلوک

## از: علامہ سید شاہ محمد عمر آمر کلیمی شاہ نوریؒ

یہ زندگی تمہاری ہے تم پر فدا رہے
ہر دم تمہاری یاد رہے تذکرہ رہے

تم دل میں ہو مکیں تو کہوں لامکان کیوں
اتنا پتہ جسے بھی رہے یا خدا رہے

اب تو زمین ہے کہیں آسمان ہے
غیر خدا نظر سے ہٹے بس خدا رہے

صورت بدل بدل کے بھی آؤ تو کیا ہوا
ہر مرتبہ فنا میں تمہاری بقا رہے

بس جسم میں تمہیں ہو مری جان و دل میں تم
دل میں تمہاری یاد زباں پر ندا رہے

ایسے شفیق تم ہو کہ تم سا کوئی نہیں
بھولے ہوؤں کی یاد میں بھی تم سدا رہے

دشمن تمہارے ہیں بھی تو تم سے ہی پلتے ہیں
تم جتنا ان کے ساتھ رہے وہ جدا رہے

تم ہو کریم اور غفور و رحیم ہو
اس سے بڑا غریب کو کیا آسرا رہے

اپنے کرم سے تم نے ہمیں شاد کر دیا
محروم کب کرم سے تمہارا گدا رہے

ایمان اور عمل پہ رکھا ہے مدارِ دیں
یہ ہے کمالِ دین کہ فضلِ خدا رہے

اس سے زیادہ اور کہو کیا بتاؤں میں
اس طرح ہو فنا کہ نہ ما و شما رہے

اسرا ہیں کہیں تو یوں احکام ہیں کہیں
ان میں خدا رہے تو وہاں مصطفیٰ رہے

آمر کی کیا بساط ہے اسرار جو کہے
نوری پیا کے سامنے وہ آئینہ رہے

**پیش کش : سید محمد باقر قادری، حضرت مکان ویلور**

# چشمِ الطاف

از متولی جعفر شریف المتخلص ظفرؔ و عادلؔ

دل سے آتی ہے صدا حمد میں لب وا کی جے
جی یہ کہتا ہے کہ وصفِ شہ والا کی جے

بزم میلاد میں ہاں شعر سخن گوئی اب
حمدِ حق نعتِ پیمبرؐ کے سوا کیا کی جے

اپنی بہبودی کا باعث ہے یہی اہل سخن
مدحتِ سرورِ کونین کو انشاء کی جے

میں ہوں بیمار محبت کا اے محبوبِ خدا
نظرِ لطف و کرم سے مجھے اچھا کی جے

نگہ فیض ہے گو نیک نہادوں پہ مدام
چشمِ الطاف اِدھر بھی مرے آقا کی جے

آئینے تا نہ ہو ویران میرا خانۂ دل
مجھ پہ احسان یہ اے شاہ خدارا کی جے

منتشر مضطرب زار پئے ہجر نبیؐ
اہل دنیا یہ مرا حال ہے دیکھا کی جے

میں گناہ گار و سیہ بخت ہوں یاشاہِ امم
بخششِ جرم ہے امروز نہ فردا کی جے

ہائے ہوتی ہیں مری جاں پہ بلائیں نازل
رحم اے احمدِ مختار ذرا سا کی جے

اب جو دیدار کو ترساتے ہو سالارِ جہاں
حشر میں یوں مجھے محتاجِ لقا نا کی جے

وقت اظہارِ تمنّائے حضوری ہے میرا
کوئی ارماں نہ یہ سرکار سے اخفا کی جے

از طفیلِ شہ کونین مقاصد میرے
اپنی درگاہ میں مقبول خدایا کی جے

والدین اور برادر مرے خویشیوں کو سبھی
دین و دنیا میں خوشا بخت ہمیشہ کی جے

سایہ تحریر کا یارب رہے جگ میں کاملؔ
سر پہ قائم مرے استاد ہیں رکھا کی جے

اب ہے اُمید اجابت کی خدا سے بے شک
اے ظفرؔ ختمِ دعا پر یہ قصیدہ کی جے

**پیش کش : الحاج یوسف خان قادری، ریلوے ڈپارٹمنٹ، بنگلور**

# نعتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

از: مولوی سید نیاز احمد جمالی آمری
پرنسپال دارالعلوم جمالیہ۔ چنئی

اے رسولِ خدائے معظم آپکا کوئی ثانی نہیں ہے
سارے ادیان ہیں مٹنے والے آپکا دین فانی نہیں ہے
وہ قیامت میں حسرت کریگا جو یہاں ہے شفاعت کا منکر
اسکو کیسے شفاعت ملے گی جس نے دنیا میں مانی نہیں ہے
روضۂ سرورِ دیں پہ جا کے قلبِ عاشق کو تسکین ملے گی
میرے آقا کا دربار ہے یہ اس جگہ حکمرانی نہیں ہے
سنتِ مصطفیٰ کی بدولت ہمکو دنیا میں عزت ملی ہے
جو حدیثوں کو چھوڑے نبی کی یہ روش مسلمانی نہیں ہے
چاند ٹکڑے ہوا تھا یقیناً دیکھکر میرے آقا کی اُنگلی
معجزہ ہے حدیثوں سے ثابت من گھرت یہ کہانی نہیں ہے
رب کی چاہت میں آباد کر لیا اولیاء کی محبت سے دل کو
نیک بندوں کی توہین کرنا ایسا حکمِ قرآنی نہیں ہے
زندگی کو غنیمت سمجھ کر نیکیوں میں لگا اپنی قوت
راہِ شیطاں سے پرہیز کر لے دائمی یہ جوانی نہیں ہے
اے نیازی رہِ مصطفیٰ پر چل کے پالے رضائے الٰہی
اتباعِ نبی کے علاوہ مطلقاً کامرانی نہیں ہے

**پیش کش : مولوی الحاج جمیل احمد شریف لطیفی، ننجنگڈھ**

سالنامہ

# اللطیف
ویلور




